فلسفہ دُعا



علامہ فضل احمد عارف

قولہ تعالیٰ اُجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون

فلسفۂ دعاء

پروفیسر علّامہ فضل احمد عارفؒ ایم۔اے

نذیر سنز پبلشرز
۴۰۔اے اردو بازار ۰ لاہور

بانیِ ادارہ: نذیر سنز پبلیشرز

نذیر حُسین ۱۹۴۱ ـ ۲۰۰۵

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین)

تحسین حُسین نے
نذیر سنز پبلیشرز۔ لاہور سے شائع کی۔

آر۔ آر پرنٹرز

Nazir Sons Publishers
40-A Urdu Bazar, Lahore. Tel: 042-7123219

فہرست

عرضِ مصنّف

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو اقبال

دُعا درحقیقت اس ازلی و ابدی صداقت کے اظہار کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ اور محض اللہ تعالیٰ ہی ہمارا حقیقی کارساز، مشکل کُشا اور حاجت روا ہے۔ ہمیں جو کچھ مِل سکتا ہے اسی کے دروازے پر دستک دینے .اور اس کا دروازہ ایسا دروازہ ہے کہ جہاں سے کسی کو دھتکارا نہیں جاتا — گویا انجیل کے پیارے الفاظ میں ——

دروازہ کھٹکھٹاؤ، تو تمہارے لیے کھولا جائے گا۔

کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے، اُسے ملتا ہے۔

اور جو ڈھونڈتا ہے، وہ پاتا ہے

مہربان آقا اُدعُونِی اَستَجِب لکم (مجھے پکارو، مَیں تمہاری دعا قبول کروں گا) کہہ کر ہمیں دعا مانگنے کی دعوت دیتا ہے اور اس کی مرضی یہ ہے کہ انسان مانگتا ہے اور وہ عطا کرتا ہے کیونکہ وہ مانگنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے سے ناخوش

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اللہ یغضب ان ترکت سوالہ

وابن اٰدم حین یُسأل یَغضِبُ

یعنی خداوندکریم سے اگر نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے جب کہ انسانوں سے کچھ

مانگا جائے تو غضب ناک ہوتے ہیں

مگر عصرِ حاضر کا انسان کتنا بدنصیب ہے کہ مادہ پرستی کا شکار ہو کر وہ دعا سے گریزاں ہے حالانکہ دُعا ہمیشہ شکستہ دلوں کا سہارا، امید کا مرکز، فلاح و کامیابی کی ضامن اور دل کی طمانیّت کی باعث رہی ہے۔

اس خدا فراموشی کے دور میں انسان کو دُعا کی حقیقت، اہمیت اور افادیت سے آگاہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہی مقصد اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا ہے۔ خُدا کرے کہ یہ مقصد اچھی طرح پورا ہو اور دُعا کے بارے میں ذہنوں کے اندر جو شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں وہ سب دُور ہو جائیں۔

موضوع کی جامعیت اور عظمت اور اپنی کم مائیگی کا مجھے احساس ہے۔ دُعا پر قلم اٹھانا گویا دین کے پورے نظامِ عبادت کا احاطہ کرنا ہے کیونکہ دُعا سرکارِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشاد کے مطابق عبادت کا جوہر ہے تاہم راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ دعا کی حکمت جہاں تک ہو سکے تحقیق کے جدید معیار پر دلچسپ انداز میں بیان کر دی جائے۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں دُعا کی حکمت و افادیت کو فلاسفہ اور علمائے سائنس کے افکار و نظریات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کا پاکیزہ تصوّرِ دُعا پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ان طریقوں اور ذرائع کو زیرِ بحث لاتا ہے کہ جو قبولِ دعا میں ممد و معاون ہیں۔ دُعا کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے ضروری تھا کہ ان الہامی دعاؤں کو بطورِ خاص موضوعِ تحقیق بنایا جائے جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں چنانچہ اس مقصد کو پیش

نظر رکھ کر باب چہارم اور پنجم قرآنی دعاؤں کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں۔
باب چہارم میں ان دعاؤں کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ الحمد للہ یہ میری تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

واللہ ھوالموفق والمستعان

تحدیث نعمت

دیباچہ طبع دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعاء، انسانی فطرت کی آواز، احتیاج کا وسیلۂ اظہار، عبودیت کی روح، عبادت کا جوہر، شکستہ دلوں کا مضبوط سہارا، بے یار و مددگار کا موثر ہتھیار، ہر درد کا درماں اور قلب پریشاں کا یقینی ذریعۂ اطمینان ہے۔ ساری الہامی کتابیں دعا کے فضائل سے بھر ہیں اور دعا مانگنا سارے مقبولانِ بارگاہ کا محبوب عمل رہا ہے۔

اس کتاب میں بڑی تحقیق کے ساتھ عقل و نقل، سائنس و فلسفہ اور نفسیات و روحانیات وغیرہ علوم کی روشنی میں دُعا کی حکمت و افادیت، قرآن و سنت کے مطابق اسلام کے امتیازی تصوّرِ دعا، قبول دُعا کے لیے ضروری شرائط اور قرآنی دعاؤں کے حقائق و معارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چند سال پیشتر جب یہ کتاب ــــ فلسفۂ دُعا ــــ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آئی تو برصغیر پاک و ہند کے علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ علماء و فضلاء نے میری اس علمی کاوش کو بے حد سراہا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ جرائد و رسائل نے شاندار الفاظ میں تبصرے کیے اور فلسفۂ دعا کو جدید اسلوب میں ایک محققانہ، منفرد، جامع، دلچسپ اور معرکہ آرا کتاب قرار دیا۔ اکثر و بیشتر تبصرہ نگاروں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ دعا کے موضوع پر آج تک ایسی جامع اور تحقیقی کوئی

کتاب ان کی نظروں سے نہیں گزری۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ذات برحق نے اس بندۂ ناچیز کی اس اولین تالیف کو اس قدر قبول عام عطا فرمایا۔ للہ الحمد والمنۃ کچھ عرصہ سے پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا چنانچہ کتاب کی افادیت اور شائقین کے تقاضے کے پیش نظر دوسرے ایڈیشن کی ضرورت تھی۔ اسی اثناء میں

نذیر حسین ناشران و مالکان نذیر سنز پبلشرز لاہور نے خواہش ظاہر کی کہ طبع ثانی ان کے ادارے کے زیر اہتمام ہو۔ چنانچہ سابقہ ناشر مولانا مقبول احمد صاحب ناظم مکتبہ رشیدیہ ساہیوال سے باضابطہ تحریری اجازت لے کر طبع ثانی کے حقوق نذیر پبلشرز لاہور کو دے دیئے گئے۔ الحمد للہ اب یہ کتاب دوسری بار نظر ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ نذر قارئین ہو رہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہم سب کے لئے نافع بنائے۔ احکام اسلامی کے مطابق ہمیں طلب آرزو کا سلیقہ سکھائے اور ہمیشہ اپنی رضا کی راحت نصیب کرے آمین

دعاگو و دعاجو

فضل احمد عارف

۲۴۶۔ شمس آباد کالونی

ملتان شہر

پیش لفظ

از قلم جناب علامہ علاؤالدین صدیقی صدر شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

یہ ایک ادبی کاوش بھی ہے اور اخلاقی خدمت بھی ——
میں "فلسفہ دُعا" کے مصنف کو قابلِ مبارکباد سمجھتا ہوں کہ انہوں نے خدا سے دور بھاگتی ہوئی مخلوق کو خدارسی کی دعوت دی ہے —— دورِ حاضر میں اخلاقی قدروں کا احیاء بے حد ضروری ہے۔ ورنہ انسانیت حیوانیت سے بدتر ہو جائے گی۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو مادیت کے طوفانی تلاطم میں انسان کو روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کی دعوت دیتے ہیں۔ انسانیت کے قلبِ مضطرب کو ایک ہی بات اطمینان بخش سکتی ہے اور وہ مالکِ حقیقی کی یاد ہے —— انسان مصیبتوں کے ہجوم میں پریشاں ہے لیکن جو پریشانیوں کو دور کر سکتا ہے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا —— رحمتِ خداوندی لَا تَقْنَطُوْا کی دعوت دیتی ہے لیکن انسان ہے کہ منہ پھیرے ہوئے نکل جاتا ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان کا فرمانِ الٰہی مایوس انسانوں کا واحد سہارا ہے اور کتنا مضبوط سہارا، لیکن انسان، کمزور سہاروں سے چلنے والا انسان، ہر طرف متوجہ ہوتا ہے خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا
دُعا کی افادیت کی تبلیغ میں مصنفِ کتاب "فلسفہ دُعا" بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں —— اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے اور مزید مفید خدمتِ دین کی توفیق بخشے۔ آمین

دیباچہ

از جناب مولانا غلام رسول مہر

مقامِ عبودیت کی سب سے پہلی اور آخری چیز دعا ہے۔ یہ نیاز و احتیاج کی وہ فکری صدا ہے جو انسانی سرشت کی گہرائیوں سے اٹھ کر مالکِ حقیقی کی بارگاہ تک جاتی ہے۔ بیچارگی اور درماندگی کی حالتِ اضطرار میں طلب لطف و رحم کی وہ پکار ہے جو بشریت کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا اور اطمینانِ قلب کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے، جب کوئی خطرہ خوفناک شکل میں اس کی طرف پیش قدمی کرتا ہے یا جب کسی امید کے چراغ کی لَو مدھم ہونے لگتی ہے تو وہ بے اختیار اس پاک ذات کی طرف لوٹتا ہے جو ارض و سماوات کی فاطر اور کائنات کی مدبّر ہے جس کے قبضۂ قدرت میں یہاں کے ہر وجود کی تقدیر ہے۔

إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ

(جب تمہیں کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کے آگے زارنالی کرتے ہو)

انسانیت کی یہی فطری پکار ہے، جس کے متعلق میرے دوست فضل احمد صاحب عارف نے ایک کتاب "فلسفہ دُعا" کے نام سے مرتب کی اور اس کے بعض اجزاء دیکھنے کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا۔ یہ سُن کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ کتاب اب چھپ کر منظرِ عام پر آنے والی ہے دورِ حاضر میں ایسی کتابوں کی ضرورت محتاجِ تصریح نہیں۔ جب مذہب سے اک گونہ بیگانگی کی رَو چل رہی ہے اور علوم جدیدہ میں انہماک نے فطری روشنی کے سامنے ظلمت کے پردے تن دیے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس دور میں حقائق کو زیادہ سے زیادہ روشن انداز

میں پیش کیا جائے اور اسی اسلوب سے کام لیا جائے، جس سے دورِ حاضر کے لوگ عموماً متعارف ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ یہ کتاب جس مقصد کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے وہ احسن طریق پر پوری ہو۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ دُعا کا مطلب بے دست و پائی اور بے عملی نہیں، اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جو مقصد دلی خلوص اور یکسوئی سے بار بار مالکِ حقیقی کے روبرو دُعا کی شکل میں پیش ہوتا ہے اس سے عزم میں زیادہ پختگی اور عمل میں زیادہ سرگرمی پیدا ہونی چاہیئے۔ ورنہ وہ دُعا نہ ہو گی۔ بلکہ ایسے الفاظ کا اعادہ ہوگا۔ جنہیں ارادہ وعمل اور خلوص وصداقت سے دور کا واسطہ نہیں۔

میرے عزیز دوست نے کتاب کے آغاز میں فلسفۂ دعا کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ چند کلمے بطور تعارف لکھ دیئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ بضاعت مرجات اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرفِ قبول پائے اور مصنفِ محترم کے حُسنِ نیت کی برکات سے مجھے بھی کچھ حصہ مل جائے۔

تقریظ

اثر خامہ ڈاکٹر محمد نصر اللہ احسان الٰہی ایم اے پی ایچ ڈی (پنجاب) پی ایچ ڈی (کینٹب)
ریڈر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی

Your lord sayeth call upon me and I will hear you: (The Quran X 162)

"Keeping the above verses in view, Mr. Fazal Ahmad Arif has written an excellent book for public reading. The reader will find it not only interesting but also very useful. The book bears an impression of novelty, variety and stands as testimony to the labour which the author has collected to materialize the same.

ترجمہ

تمہارے رب نے فرمایا ہے "مجھے پکارو، اور میں تمہاری پکار کو سنوں گا۔"
(القرآن) ۱۰/۱۶۲

مندرجہ بالا آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فضل احمد صاحب عارف نے عوامی مطالعہ کے لئے ایک مہتم بالشان کتاب تحریر کی ہے۔ قارئین کرام اس کتاب کو نہ صرف دلچسپ پائیں گے بلکہ بے حد مفید بھی۔ کتاب اپنے دامن میں جدّت اور تنوّع کی خوبیاں لئے ہوئے ہے۔ اور مُصنف کی محنت اور عرق ریزی کا بیّن ثبوت ہے۔

ماخذ و مصادر

ا۔ کتب بزبان عربی

۱۔ القرآن الحکیم
۲۔ صحیح بخاری
۳۔ صحیح مسلم
۴۔ جامع ترمذی
۵۔ سُنن ابی داؤد
۶۔ سُنن ابن ماجہ
۷۔ سُنن نسائی
۸۔ مسند احمد
۹۔ مشکاۃ المصابیح
۱۰۔ کنز العمال
۱۱۔ احیاء علوم الدین، غزالی
۱۲۔ اسباب النزول سیوطی
۱۳۔ تفسیر ابن جریر طبری
۱۴۔ تفسیر کبیر رازی
۱۵۔ تفسیر کشاف زمخشری
۱۶۔ تفسیر جلالین
۱۷۔ تفسیر ابن کثیر
۱۸۔ المفردات فی غریب القرآن
۱۹۔ تہذیب الاسماء واللغات
۲۰۔ سیرت ابن ہشام
۲۱۔ البدایہ والنہایہ، ابن کثیر
۲۲۔ نہج البلاغہ

ب۔ کتب بزبان اُردو

۲۳۔ تفسیر بیان القرآن
۲۴۔ تفسیر ترجمان القرآن
۲۵۔ عہد نامۂ قدیم
۲۶۔ عہد نامۂ جدید

ج۔ کتب بزبان انگریزی

۲۷۔ ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ ان اسلام (علامہ اقبال)
۲۸۔ ورائٹی آف ریلیجیس ایکسپیریئنس (ولیم جیمس)
۲۹۔ سٹوری آف فلاسفی (ول ڈیوراں)
۳۰۔ دی، قرآن اینڈ اٹس کرانیکل اینجمنٹ (محمد اجمل)
۳۱۔ دی قرآن (راڈویل)
۳۲۔ ورکس آف ڈیل کارینگی
۳۳۔ اے ڈکشنری آف اسلام (ٹامس ہیوز)
۳۴۔ آن ہیپی نیس (ٹامس کارلائل)
۳۵۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مطبوعہ لائیڈن
۳۶۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا مطبوعہ لنڈن
۳۷۔ ریڈرز ڈائجسٹ متعدد شمارے

باب اوّل

دُعا کی حکمت اور افادیت

دُعَاء مانگنا عین انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ چنانچہ جب ہم مبتلائے آلام ہوتے ہیں۔ اور مصیبتیں ہمیں چاروں طرف سے آگھیرتی ہیں تو ہمارے ہاتھ دعا کے لیے بے اختیار اُٹھ جاتے ہیں۔ دلِ مضطرب سے معاً الفاظ پکار بن کر نکلتے ہیں۔ بے ساختگی کے عالم میں نکلی ہوئی یہی آواز —— دعا کہلاتی ہے۔

مصیبت میں پکارنے کی جبلّت (Appeal instinct) ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ انسان اپنے اس جبلی ادراک کے تحت ایک برتر ہستی کے سامنے اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہے اور اسے فریاد رس سمجھ کر امداد و اعانت کا طالب ہوتا ہے۔

دینِ فطرت کا ترجمان بھی اس انسانی فطرت (Human Nature) پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتا ہے۔

اِذَا مَسَّ الاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْباً اِلَیْہِ القرآن ۳۹/۸

"جب انسان کو کوئی نقصان پہنچے تو اپنے پالنے والے کو پکارتا ہے اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔"

پکارنے کی اس جبلّت کی تعدیل (Sublination) کی صحیح صورت اللہ اور صرف اللہ سے دُعا مانگنا ہے۔

کیونکہ اللہ کا تصور ایک کامل، بلند اور عظیم ترین ہستی کا تصور ہے۔ فقط اسی ذات کو پکارنے سے انسان کا شرفِ انسانیت محفوظ رہ سکتا ہے اور اپنے ایسوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلّت سے بچ رہتا ہے۔

دُعا مانگنے کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنا کہ انسان خود۔ انسان قدیم الایام سے دعا مانگتا چلا آرہا ہے۔ مصائب و شدائد پر قابو پانے اور عظیم مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر انسان نے ہمیشہ دُعا کا سہارا لیا ہے۔

ازمنہ مظلمہ (Dark Ages) کا وحشی ہو یا عصر النور —— کا

مہذب دعا کی افادیت میں کسی کو مجال انکار نہیں۔

دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں دعا کا تصور پورے خد وخال کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ مذاہب کا نقطۂ ارتکاز ہی دعا ہے۔ اور مذہب کی باقی عمارت بھی اسی پر مبنی ہے۔ دنیا میں جس قدر مذاہب ہیں۔ اسی قدر اُن کی عبادت کے طریقے مختلف ہیں۔ مگر ان سب میں قدرِ مشترک (Common Element) اگر کوئی ہے۔ تو وہ یقیناً دعا ہے۔

تاریخِ مذاہب کی ورق گردانی سے بھی یہ حقیقت اُجاگر ہو جاتی ہے کہ ہر مذہب نے اپنی تعلیمات میں دعا کو امتیازی جگہ دی ہے۔ بلکہ بعض نے تو بہت زیادہ تکلّف اور تکلیف سے کام لیا ہے۔

انسان کی تاریخ خواہ ہبوطِ آدمؑ سے شروع کی جائے یا بندر کی ترقی یافتہ صورت وحشی انسان سے، یہ صداقت اپنی جگہ برابر قائم ہے کہ دعا کا تصوّر، قدیم ترین تصوّر ہے اور نظری وعملی دونوں صورتوں میں اب تک مُوجود ہے۔

یہ شانِ بقا اس امر کی شاہد ہے کہ دعا یقیناً اپنے اندر صلاحیتِ بقا رکھتی ہے کیونکہ سنتِ الٰہی اور قانونِ فطرت کے مطابق صرف اسی چیز کو بقا حاصل ہے جو اپنے میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (القرآن الکیم)

"جھاگ مٹ جاتا ہے اور صرف وہی چیزیں زمین پر باقی رہتی ہیں۔ کہ جن میں نوعِ انسان کے لئے افادیت موجود ہو۔

پس ہیگل (Hegel) کا جدلیاتی فلسفہ (Dialectical Process) ہو یا لیمارک (Lemarck) کا قانون بقائے اصلح (Survival of the Fittest) دعا ہر کسوٹی پر پورا اترتی ہے۔

دعا اپنے وجود اور بقا کی شہادت سے اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ یہ عبث اور بے فائدہ عمل نہیں۔ اگر دعا بے فائدہ ہوتی تو انسان اسے بار بار مانگنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ کیونکہ کوئی ذی شعور، مضر حرکت کا اعادہ پسند نہیں

کرتا اور اس طرح یہ دعا کبھی کی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی۔

امریکی فلسفہ دان چارلس سانڈرس پیئرس (C.G. Pierce) کے اصول کے مطابق صداقت کا معیار افادیت ہے اور دعا کی افادیت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

پس یہ امر دعا کی حقانیت کو روزِ روشن کی طرح ظاہر کرتا ہے۔

فلاسفہ اور منصف مزاج علمائے سائنس کے نزدیک دعا قطعاً فعلِ عبث نہیں، یونانی فلسفی بڑے شد و مد سے دعا مانگا کرتے تھے۔ بعض نے دُعا کو اگر ہدف تنقید بنایا ہے تو وہ اس وجہ سے کہ دعا کے ساتھ کچھ لوازم ایسے شامل کر دیئے گئے تھے کہ جو دُور از کار اور فضول تھے، نیز دعا وہاں رہبانیت اور ترکِ عمل کی مظہر بن چکی تھی۔

چنانچہ زینو (Zeno) نے جہاں رواقیوں کے طریقِ دعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی وہاں نفسِ دعا کے وجوب اور استجابت سے ہرگز انکار نہیں کیا۔ زینو نے پُرزور اعلان کیا کہ دعا یقیناً نیک، پاک بازاور خدا رسیدہ انسان کی مقبول ہو سکتی ہے۔

دعا کے متعلق ہمیشہ اربابِ بصیرت کی یہی رائے رہی ہے کہ یہ ایک مفید عمل ہے۔ فلسفہ کی تاریخ، یونان سے شروع ہوتی ہے اور سقراط (Socrates) یونان کا ایک عظیم فلسفی تھا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اسی کی ذات سے یونانی فلسفہ کی نمود ہوئی۔

سقراط کا دعا کی حقانیت پر کامل ایمان تھا اور اسی ایمان پر اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

توحید و حق گوئی کی پاداشں میں جہلا کے اژدحام نے اس بزرگ فلسفی کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ اور "عدالت" نے اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

سفرِ آخرت کی تیاری تھی، زہر کا پیالہ سامنے دھرا تھا۔ بزرگ فلسفی کے ضمیر اور وجدان نے رہنمائی کی، زبان سے بے اختیار نکلا۔

"مجھے ضرور، بالضرور خدا سے دعا مانگنا چاہیئے، کہ میرا اس دنیا سے اگلے جہاں کو یہ سفر کامیاب رہے۔ اور برومند ہو، بس یہی اور یہی میری دعا ہے!

لب دعا سے ہل رہے تھے اور چہرے کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا کہ ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور اپنے وقت کے بہت بڑے انسان نے زہر کے تلخ جام کو اپنے منہ سے لگا لیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ دُعا آشنا لبوں کو زہر کی تلخی شہد سے بھی شیریں محسوس ہو رہی تھی۔

سقراط کے بعد افلاطون (Plato) نے اپنے استاد کے افکار و اعمال کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا اور انہوں نے اس جادۂ حق سے سرمو انحراف نہ کیا۔ جس پر سقراط زندگی کے آخری سانس تک قائم رہا تھا۔

افلاطون کی موت نے ارسطو کے لیے فلسفے کا میدان خالی کر دیا۔ ارسطو کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ زمانہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ یوریمیڈن (Eurymedon) نامی ایک پروہت نے الزام لگایا کہ ارسطو نے کہا ہے۔

"دعاؤں اور قربانیوں میں کچھ نہیں رکھا اور یہ بے سود محض ہیں"۔

الزام درست تھا یا غلط؟ تاریخ اس کی وضاحت نہیں کر سکی۔

ارسطو نے نہ تردید کی نہ تائید بلکہ جان بچا کر بھاگ نکلا (Chalcis) کالکس کے مقام پر پہنچا تو بیماری نے آلیا۔ دیو جانس لائرٹیس (Diogenes Laertius) کے بیان کے مطابق چونکہ زمانے کی ہوا، اپنا رُخ بدل چکی تھی اور حالات ناساز گار تھے لہٰذا رحمتِ رب سے مایوس، فلسفی نے زہر پی کر خودکشی کر لی.......

شاید یہ دُعا سے انکار کی سزا تھی؟ ورنہ

کہاں ایک فلسفی اور کہاں خودکشی کا مذموم عمل۔ سقراط کی شہادت میں جس قدر عظمت، جلالت اور وقار ہے اسی قدر ارسطو کی خودکشی میں بزدلی اور گراوٹ ہے۔

ارسطو نے بھی وہی زہر پیا، جو اس سے پہلے سقراط کے گلے سے اُتر چکا تھا۔ مگر دونوں کے پینے میں زمین و آسماں کا فرق ہے۔

لکریٹیس (Lucretius) جو سیزر اور پومپیائی تہذیب کا ہم عصر فلسفی ہو گزرا ہے اس کا قلم اور زبان ہمیشہ امن اور سلامتی کی دعاؤں سے تر رہے۔

فرانسس بیکن (Fancis Bacon) صرف فلسفی نہیں ۔ سائنس دان بھی تھا ۔ اس پر کئی بار الحاد کا الزام لگایا گیا ۔ مگر اس کی تعلیم اور عمل نے ہمیشہ اس کی تردید کی بلکہ اس نے اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کہ فلسفے کا گہرا مطالعہ مذہب کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

اس کے اپنے الفاظ میں

"A little philosoply inclineth a man's mind to atheism hut depth in philosophy bringeth man's mind about to religion.

فلسفے کا تھوڑا علم انسان کو کفر اور الحاد کی طرف لے جاتا ہے ۔ مگر اس کے گہرے مطالعہ سے انسانی ذہن یقیناً مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے ۔

اسی انگریز فلسفی نے اپنے ایک مضمون (Of Death) میں جلد مرنے کی دُعا کی جو قبول ہوئی اور تھوڑا عرصہ بعد اس نے اپنی جان شیریں ، جاں آفریں کے سپرد کر دی ۔ اس کی وصیت کے پُر خلوص دعائیہ الفاظ آج تک تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کر رکھے ہیں ۔

I bequeath my soul to God ...... My body to be burried obscurely. My name to the next ages and to foreign nations.

میں اپنی رُوح کو مالکِ حقیقی کے سپرد کرتا ہوں ۔ میری میت کو وہاں دفن کرنا جہاں کوئی نہ آتے جاتے مگر میرا نام تو آنے والے لوگوں کے لیے ہمیشہ یادگار رہے گا ۔

فرانس کی سرزمین سے بھی بہت فلسفی اُٹھے ہیں ۔

والٹیئر (Voltaire) ان کا سرخیل تھا ، یہ فلسفی بھی دُعا کا قائل تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ پادری دُعا کے صحیح تصور پر توہمات کے پردے ڈال رہے ہیں اور اس میدان میں انہوں نے اس قدر گرد اڑادی ہے کہ رُوئے حقیقت چھپ کر رہ گیا ہے تو انہوں نے دعا کے مقدس چہرے سے نقاب اُٹھانے کی خاطر نوک قلم سے کام لیا ۔

جوشِ اصلاح میں بہت کم لوگ جادۂ اعتدال پر گامزن رہ سکتے ہیں ۔ چنانچہ والٹیئر

کے افکار اور تحریروں میں بھی شدّت کا رنگ جھلکتا ہے۔ آخیر عمر میں تو یہ فلسفی بہت زیادہ خدا پرست ہو گیا تھا اور دعائیں مانگنا اس کی زندگی کا معمول قرار پایا تھا۔

زندگی کا چراغ بجھا چاہتا تھا کہ پیرس کے آخری دیدار لینے لگی، بدقت تمام اپنے خوابوں کے شہر میں پہنچا، بنجامن فرنیکلن اپنے پوتے کو ساتھ لیے حاضر ہوا۔ بزرگ فلسفی سے بچے کے سر پر دستِ مبارک پھیرنے کی استدعا کی۔ چنانچہ اس نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور دُعا دی کہ اس کی زندگی خدا اور آزادی کے لیے وقف ہو۔

بنجامن فرنیکلن Benjamin Franklin / خود بھی دعا کے اعجاز اثر کا قائل تھا۔ چنانچہ ۱۷۸۷ء میں جب دستور ساز کنونشن (Constitutional Convention) بحران کا شکار ہوئی اس نے پر زور تلقین کی کہ روزانہ دُعا مانگی جائے۔

مزید فرمایا۔

"I have lived, sir, a long time, and the longer I lived, the more convincing proofs I see the God governs in the affairs of men. We have been assured, sir in this sacred writings, that except the lord builds the house, the labour in vain that build it. I firmly believe this, and I also believe that without His concurring aid, we shall succeed in this political building no better than the builders of Babel."

ترجمہ:۔ میں نے خاصی لمبی زندگی بسر کی ہے اور جس قدر زیادہ عرصہ میں زندہ رہا ہوں۔ اسی قدر مجھے قائل کرنے والے ثبوت ملے ہیں کہ انسان کے سب امور مشیتِ ایزدی کے تابع ہیں، مقدس صحیفے بھی ہمیں اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ جب تک مالکِ حقیقی اللہ خود مکان کی تعمیر نہ کرے۔ لوگ کہ جو تعمیر کر رہے ہوتے ہیں ان کی محنت اکارت جاتی ہے۔

میرا اس پر پختہ ایمان ہے اور اس پر بھی، کہ

توفیق الٰہی اور تائید ایزدی کے بغیر اگر ہم اس سیاسی تعمیر میں کامیاب بھی ہو گئے تو ہمارا حشر معمارانِ بابل سے مختلف نہیں ہو گا۔ ۱۲

یقیناً تجربہ اور وجدان اس امر پر کافی دلائل رکھتے ہیں کہ محض عمل کافی نہیں بلکہ کامیابی کے لیے سعی و عمل کے ساتھ ساتھ دُعا کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔ تائید ایزدی کے ہم ہر حال میں محتاج ہیں۔ اکثر اوقات ہمارے ارادے اور کام شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے، حالانکہ اپنی فہم و فراست کے مطابق ہم نے درست ذرائع کام میں لاتے ہوتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اسی حقیقت سے وجودِ آلہ پر حجت قائم کرتے ہیں آپ کا مشہور قول ہے:۔

عَرفتُ رَبی بِفَسخِ العزائم

میرے کچھ ارادے تھے، جو پورے نہ ہو سکے، میرے کچھ عزائم تھے جو ٹوٹ گئے، حالانکہ میں نے پوری کوشش کی تھی اور صحیح طریق کار اختیار کیا تھا۔ اسی سے میں نے سمجھ لیا، کہ مجھ سے بالا کوئی ہستی ضرور ہے، جب تک وہ نہ چاہے، میرا کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

دُعا یقیناً ہمارے عزائم اور ہمارے ارادوں کو کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں جنگ میں فلاح و کامرانی کے لیے عمل یعنی ثابت قدمی کے ساتھ ہی ذکر اللہ یعنی دعا ضروری قرار دی ہے۔

حکمائے اسلام کو جس قدر دعا سے اُنس تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جابر بن حیان صرف کیمیادان ہی نہیں تھے، بلکہ مستجاب الدعوات صوفی بھی تھے، ابوالقاسم زہراوی، ابن سینا، البیرونی، الغزالی اور امام رازی سب بزرگ توفیق الٰہی کی طلب سے اپنے کو بے نیاز نہیں سمجھتے تھے۔ تجربہ گاہوں میں جہاں کیمیاوی عمل کیے جاتے تھے۔ وہاں دعا کے رُوحانی عمل کو کبھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔

قرآن پاک نے جہاں ارض و سما کے مناظر و مظاہر میں تدبر و تفکر کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ان کی دعا مانگنے کی عادت قابلِ تقلید ہے

کچھ عرصہ سے بعض سائنس دان مادیت پرستی کے نشہ میں سرشار ہو کر دعا کو بھلا بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ نشہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ انسان بالآخر روحانیت کی طرف رجوع کرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

عہدِ حاضر کے حق شناس سائنس دان دعا کی ضرورت اور اس کی محیّر العقول طاقت سے بے خبر نہیں، چنانچہ اب بھی بقول عظیم سائنسدان چارلس سٹینمٹز (Charles Pstenin̈metz)

،، وہ دن دور نہیں جب کہ ہم اپنی تجربہ گاہوں (Laboratories) میں دعا کو لے آئیں گے۔ اور ان کے بل بوتے پر زبردست طاقت ہمیں میسر ہو گی۔ ۱۲۔

دعا کی حقانیت ایک امر مسلّم اور اس کا اثر معروف ہے، ظن یقین کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھہر سکتا، سائنس اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے ابھی اگر دعا کی صحیح حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہے تو اسے رد کرنے کے لئے اس کے پاس کون سے یقینی دلائل ہیں؟

بقول امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز۔

،،سائنس خواہ کچھ بھی کہے مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے دعا اور عبادت کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ مگر جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے، اس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔،،

موجودہ دور میں تو دعا کی قدر و قیمت اور ضرورت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ تابکاری آلاتِ جنگ کی وجہ سے دنیا کا امن خطرے میں ہے۔ جنگ کے سیاہ بادل افقِ عالم پر منڈلا رہے ہیں اور جوہری جنگ کا نتیجہ کشتِ حیات کی مکمل تباہی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

مگر اس یاس آفریں ماحول میں بھی امید کی ایک کرن چمک اٹھتی ہے۔ اور یہ — دعا ہے۔ بلاشبہ عالمی جنگ کے اس خطرے کو مناسب اقدامات اور پرخلوص دعاؤں ہی سے ٹالا جا سکتا ہے۔

آج یو۔ این۔ او میں دھوآں دھار تقریروں کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کارخانوں میں آتشیں اسلحہ سازی کی حاجت ہے، بلکہ ڈاکٹر نیبہر (Dr. Niebuhr) کے نقطہ نظر کے مطابق ان پرسوز دعاؤں کی ضرورت ہے، جو ہمارے باطن میں انقلاب پیدا کر کے ہمارے دشمنوں کو بھی یقین دلا دیں کہ ہم امن پسند ہیں۔ دشمن کی تخریبی نیتوں اور برے ارادوں کو بدلنے کی خاطر دعاؤں سے بخوبی کام کیا جا سکتا ہے۔

دعائیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر انقلاب لاسکتی ہیں۔ ایسا انقلاب کہ جو احترام آدمیت سکھائے اور انسانیت کو فروغ دے۔

عصر حاضر کے مقتدر سیاستدان اور امنِ عالم کے علمبردار امریکا کے صدر آئزن ہاور (Eisenhower) کی دوررس نگاہ میں بھی مسائلِ عالم کے حل میں دعائیں یقیناً کارگر ثابت ہوسکتی ہیں۔ عالمی امن کا خواب اسی صورت میں شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ کہ

ہم ـــ روحانیت پر ایمان رکھنے والے سب لوگ،

اس نیک مقصد کی خاطر متحد ہو جائیں اور اپنی تمام تر مساعی کو قیامِ امن کے لئے وقف کر دیں اور پُرخلوص دعاؤں کو اپنا معمول بنالیں۔

سابق صدر امریکہ کے پیغام کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"If this mass dedication launched an ending campaign for peace, supported by prayer, I am certain wonderous results would eusue."

اگر عوام اپنے آپ کو اس نیک مقصد کی خاطر وقف کر دیں اور امن کی خاطر ختم نہ ہونے والی ایسی مہم چلائیں، جس کی پشت بانی کے لئے دعائیں ہوں تو مجھے یقین ہے کہ حیرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے،،

دوسری جنگ عظیم کے موقع پر ہم نے دیکھا ہے کہ کٹر سے کٹر مادیت پرست، روحانی طاقت کی خوشہ چینی پر مجبور رہا۔ ان دنوں دعا ہر خاص و عام سے اپنی افادیت کا سکہ منا رہی تھی۔ وفعتاً انسان کو اس امر کا احساس ہوا کہ روحانی اقدار اس وقت، انسانیت کے لیے بہیمیت کے خلاف ایک موثر قوت ہیں۔

مگر انسان کتنا احسان فراموش ہے۔!

جب مصیبت دور ہو جاتی ہے اور نعمت میسّر آجاتی ہے تو خدا کو یکسر بھول جاتا ہے۔

ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ (القرآن ۳۹)

پھر جب اللہ تعالےٰ اپنی جانب سے کوئی نعمت عطا کر دیتا ہے تو جس کے لئے

پہلے سے (خدا کو) کو پکارتا تھا اسکو بھول جاتا ہے۔

اس افسوسناک عادت کو قرآن پاک نے ایک مثال سے بھی واضح کیا ہے کہ "جب لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو دینی اخلاص کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ مگر جب خشکی پر محفوظ پہنچ جاتے ہیں تو فوراً شرک کرنے لگ جاتے ہیں"
(۲۹/۶۵)

کتاب اللہ نے مزید بتایا ہے کہ

"ان کے شرک کی صورت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنی عقلمندی کی بدولت محفوظ رہتے ہیں (نعوذ باللہ) اس میں خدا تعالےٰ کا کہاں ہاتھ ہے۔

اِنَّ الانسَانَ لِربّہٖ لکنود (القرآن) ۱۰۰/۶

"واقعی انسان اپنے پالنے والے کا بڑا ناشکرا ہے۔"

دنیا کا امن ہو یا دل کا چین، دعا ہر جگہ اپنا بے پناہ اثر رکھتی ہے۔

اطمینان قلب (Peace of Mind) ایک نعمت ہے کہ اسے بڑی سے بڑی دولت کے ذریعہ بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ بعض اوقات ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ روپیہ پیسہ ہو تو اطمینانِ قلب بھی مل جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔

مادی لحاظ سے ہم خواہ کتنے ہی فارغ البال کیوں نہ ہو جائیں ضروری نہیں کہ اطمینانِ قلب بھی میسّر ہو، بلکہ جن کی تجوریاں سیم و زر سے بھرپور ہوتی ہیں، ان کے سینے اکثر خلوص و اطمینان سے خالی ہوتے ہیں۔

بہت سے ایسے دولت مند اور سرمایہ دار ہیں کہ جنہیں سارے مادی وسائل اور سہولتیں میسّر ہیں۔ مگر ان کی زندگی بالکل اجیرن ہے، اور لمحہ بھر کا اطمینان بھی انہیں حاصل نہیں بعض علماء کا خیال ہے کہ فلسفے کا علم قلبی اطمینان کا باعث ہے، یہی وجہ ہے کہ افلاطون فلسفے کو "آں عزیز مسرت" کہہ کر یاد کرتا ہے۔

مگر جہاں تک خود فلاسفہ کی زندگیوں کا تعلق ہے، وہ خود اسی کے لئے سرگرداں رہے ہیں، ان کے ہاں بھی یہ جنس، جنس نایاب اور کبریت احمر کا درجہ رکھتی ہے۔

اس سلسلے میں فیلسوفِ اسلام ڈاکٹر اقبالؒ کی رائے نہایت صائب دکھائی دیتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ فلسفے کے مطالعہ سے اطمینانِ قلب کی دولت میسّر نہیں آسکتی۔ہاں اتنا ضرور کہ فلسفی اشیا اور امور کو عام سطح سے بلند ہو کر دیکھتا ہے اس لئے اسے کسی قدر مسرّت حاصل ہو جاتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ اسباب معلوم کر لئے جائیں کہ جن سے بے چینی اور افسردگی پیدا ہوتی ہے۔

جذباتی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم بے چین، مایوس اور پریشان اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ہم نے کسی سے امیدیں لگا رکھی ہوتی ہیں اور جب وہ امیدیں پوری نہیں ہو پاتیں تو ہم افسردگی (Frustration) کا شکار ہوتے ہیں۔

اسپنوزا (Spinoza) کے افکار کا ماحصل یہی ہے کہ امید کا پورا نہ ہونا ہی ہمارے دُکھ کا باعث ہے۔

مشہور عالم قنوطی فلسفی شوپن ہار (Schopenhauer) مزید کہتا ہے کہ عدم سکون کا دوسرا باعث ھل من مزید ؟ کا رجحان ہے۔

یعنی، ایک خواہش اگر پوری بھی ہو جائے تو تسلی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک اور خواہش پیدا ہوتی ہے اور بالآخر یہ اپنے جلو میں حرمان و یاس کو لاتی ہے۔

لمبی لمبی امیدیں اور خواہشات یقیناً عدم اطمینان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ فطرت نے طولِ امل کی پُرزور مذّمت کی ہے۔ اور ہمیشہ قناعت کی تعلیم دی ہے۔

قناعت فلاسفہ خصوصًا ارسطو اور سینکا (Seneca) کے نزدیک بھی باعثِ مسرت ہے۔

دُعا اطمینانِ قلب کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں جو دعائیں بھی کی جائیں گی ان میں غیر ضروری خواہشات کو دخل نہیں ہوگا۔ دعائیں ہماری آرزؤں تمناؤں اور خواہشوں میں نکھار پیدا کرتی ہیں اور ہمیں قناعت کی دولت بخشتی ہیں۔ دعا کا سب سے بڑھ کر فائدہ یہ ہے کہ اس سے اطمینانِ قلب کی نعمت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ دل انقباض کے بعد ایک قسم کی طمانیّت، کشادگی اور رنج والم کے بعد فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے۔ ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) کا نظریۂ مسّرت دعا کی حکمت

کا ایک پہلو خوب واضح کرتا ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہم اگر خوشی کو براہِ راست منتہائے مقصود نہ بنالیں تو خوشی خود بخود حاصل ہو جاتے گی۔ ہم جب اپنا مطمح نظر براہ راست مسّرت کو بنا لیتے ہیں یا تجزّیہ کرنے لگتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ ذہنی کوفت ہوتی ہے اور ہم دکھی ہوتے ہیں۔

دعا کی خوبی ملاحظہ ہو کہ تکلیف میں ہم دعا مانگتے ہیں تو اس وقت صرف دل کا اطمینان ہمارا مطمح نظر نہیں ہوتا بلکہ ہماری خواہش ہوتی ہے۔ کہ وہ مصیبت دُور ہو جائے یا کوئی آرزو پوری ہو۔

چنانچہ دعا کے بعد خواہ مصیبت دور ہو یا نہ ہو، آرزو پوری ہو یا نہ ہو دل کو تسلی ضرور ہوتی ہے۔

تضرّع اور گڑگڑا کر دعا مانگنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ غم و یاس کے بادل جو دل و دماغ پر چھائے ہوتے ہیں، وہ اشک بن کر برس جاتے ہیں اور اس طرح دُکھ درد کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (القرآن)

(اچھی طرح یاد رکھو کہ ذکر اللہ سے دل اطمینان پاتے ہیں)

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) نے ایک بار کہا تھا کہ مصیبتیں اگر بڑی ہوں تو ان کو برداشت کرنے کے لئے تسلیاں اور دلاسے بھی اتنے بڑے ہونے چاہئیں۔

ارڈس وائٹ مین (Ardis Whitman) نے اس پر کہا کہ دعا ہی سب سے بڑا دلاسا اور تسلی ہے۔ مزید وہ کہتا ہے کہ ہماری دعا یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ الٰہی مجھے اس مصیبت سے نجات دے۔ بلکہ یہ کہ اے اللہ ہمیں اس کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما اور دعا مانگتے وقت ایسا انداز اختیار کرنا چاہیئے گویا کہ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ خدا ضرور ہماری دعا کو شرفِ قبول بخشے گا۔

اگر لوگ دعا کا سہارا نہ لیا کرتے تو آج دنیا ایک وسیع پاگل خانہ ہوتی۔ کیونکہ طبیعت کا گھٹا گھٹا رہنا، رنج و الم کی شدت اور استمرار، ہمیشہ جنون اور پاگل پن پر منتج ہوا کرتے ہیں۔

زیردستوں کا ہمیشہ یہی سہارا رہا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے دعا کو شکست خوردہ ذہنیت کی پیداوار کہہ دیتے ہیں۔

لیکن یہ الزام اس طرح کا الزام ہے کہ ضرورتِ علاج کو بیمار ذہن کی پیداوار کہہ دیا جائے۔

دیکھنا تو یہ ہے کہ آیا دعا سے شکست خوردہ لوگ اور زیادہ بے حوصلہ ہو جاتے ہیں یا اس سے ان کے حوصلے بڑھتے ہیں، دُکھ درد میں دعا سے انہیں راحت پہنچتی ہے یا اذیت بڑھتی ہے۔؟

تجربہ بتائے گا کہ دعا سے کمزوروں نے مصائب میں آسودگی اور راحت محسوس کی ہے۔ اور اسی کے سہارے وہ لوگ قعرِ مذلت سے نکل کر بامِ عروج تک جا پہنچے ہیں۔

دعا قدرت کے اسبابِ مؤثرہ میں سے ایک ہے۔ جس طرح قادرِ مطلق نے دواؤں میں تاثیر رکھ دی ہے، کہ ان کو استعمال کر لیا جائے تو بیماری دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دعائیں بھی خالی از اثر نہیں۔ نظامِ علاج کا فلسفہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ جاندار کے اندر ایک ایسی قوت موجود ہے جسے قوتِ مدبّرہ بدن کا نام دیا جاتا ہے اور جب وہ بیماری پیدا کرنے والے اسباب و عوامل خواہ وہ فاسد مادہ ہو یا جراثیم ہوں یا کچھ اور کی مدافعت اور مقابلہ (Resistance) نہیں کر سکتی، تو بیماری جاندار پر غالب آجاتی ہے۔

معالج کا کام یہ ہے کہ وہ اس قوت مدبّرہ بدن کو مزید قوت بہم پہنچائے۔ تاکہ وہ بیماری پر غلبہ پالے۔

علاج بالضد (Alopathy) ہو یا علاج بالمثل (Homoeopaty) سب اس اصول کے ماتحت رکھے گئے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دوا کی ہلکی سی مقدار ہوتی ہے۔ بلکہ جس قدر دوا کی تاثیر کو تیز اور دیرپا کرنا مطلوب ہو اسی قدر اس کو تطیف کرتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں اصل دوا کی مقدار نہایت ہی قلیل رہ جاتی ہے مگر تجربات شاہد ہیں کہ وہی چند قطرے، خطرناک سے خطرناک مرض کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہومیوپیتھک ادویہ میں مجرّد دوا کی اتنی قدر قلیل مقدار ہوتی ہے کہ اگر شیشیوں کے لیبل اتار دیئے جائیں تو ہمارے پاس کوئی ایسا معروضی طریقہ نہیں کہ جس سے دوائیں

کو دوبارہ پہچان سکیں۔

مگر ان ساری باتوں کے باوجود یہ ایک سائنٹیفک طریقِ علاج تسلیم کیا جاتا ہے اور ان دواؤں کی شفائیہ تاثیر پر ہمارا محکم ایمان ہے۔

جس طرح دواؤں کے بارے میں ہمیں شک نہیں گزرتا اور اگر گزرتا بھی ہے تو بے بنیاد ہے اسی طرح دعائیں بھی بلاشبہ تاثیر سے بھرپور ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دوا اپنی مسلّم شفائیہ تاثیر کے باوصف بعض اوقات ناکام بھی رہتی ہے۔ مجرب دواؤں کے ہوتے ہوئے بیماریوں پر مکمل طور سے قابو نہیں پایا جا سکتا۔ بلکہ جس قدر ہم نے طریقِ علاج میں ترقی کی ہے۔ اسی قدر بیماریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ ٹی بی، نیوروسس، اپنڈے سائٹس اور کینسر وغیرہ ایسے امراض ہیں کہ پرانے زمانے میں انکا نام تک مشکل سے سننے میں آتا تھا۔ اور آج کوئی گھر ایسا نہیں جس میں یہ بلائیں نازل نہ ہوتی ہوں

موت تو آج بھی بالیقین ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ موت کے مقابلے میں علاج کی اس مکمل شکست کے بعد بھی کوئی ایسا ذی شعور نہیں جو دواؤں کو ترک کر دینے کا مشورہ دے۔

اسی طرح اگر بعض اوقات دعائیں بادی النظر میں ناکام دکھائی دیں تو ہمیں ان کے بے سود اور عبث ہونے کا یکطرفہ فیصلہ نہیں کر دینا چاہیئے۔

دعا بنفسہٖ دوا کی طرح تاثیر رکھتی ہے۔ بلکہ موثرات طبیعیہ میں سے سب سے زیادہ سریع التاثیر ہے۔

طب، فلسفہ اور نفسیات کا یگانہ روزگار امریکی عالم ولیم جیمز (William James) رقمطراز ہے:۔

یہ بات طبی تجربے سے بھی پایۂ یقین کو پہنچ چکی ہے کہ خاص ماحول میں دعا شفا میں مد ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ایک طریقِ علاج سمجھ کر اس کی تائید کرنا چاہیئے اخلاقی امراض میں تو دعا اور زیادہ یقینی طور پر کارگر ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بیکار سمجھنا اخلاقاً بھی مضر ہوگا۔

دنیا میں کئی ایسے طریقہ ہائے علاج ہیں جن میں مریض کو دوا کھلانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

مثلاً عمل تنویم (Hypnotizm) میسمریزم ان سب میں قوتِ ارادی

(Will Power) سے کام لیا جاتا ہے۔ اور القا پذیری (Suggestion) اور خود تاثری (Auto-Suggestion) کے ذریعہ مریض شفایاب ہو جاتے ہیں ہر انسان میں القا پذیری یعنی (Suggestion)، قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر کسی بھلے چنگے آدمی کو کچھ لوگ بیماری کا شک ڈال دیں تو وہ اپنے کو بیمار محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔

ہمارے ایک محترم پروفیسر سنایا کرتے تھے کہ جب وہ نفسیاتی علاج کے ایک کلینک میں ملازم تھے تو وہاں دستور یہ تھا کہ جب تک افسر اعلیٰ بیٹھا رہتا۔ باقی تمام ماتحتوں کو بیٹھنا پڑتا۔ جب وہ اُٹھ کر چلا جاتا تو سب کو اجازت تھی خواہ وہ بیٹھیں یا چلے جائیں۔

ایک دن ماتحت ملازموں کو کسی پارٹی میں شامل ہونا تھا اور سب رخصت کے خواہاں تھے مگر سب کو رخصت کہاں مل سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ جو بھی افسر اعلیٰ کے پاس جائے وہ ان کی صحت کے متعلق تشویش ظاہر کرے۔

حسبِ منصوبہ ایک صاحب کاغذات لے کر افسر اعلیٰ کے پاس گئے اور دستخط کرانے کے بعد بولے۔

"صاحب! رات آپ نے آرام نہیں کیا تھا؟ نصیبِ اعدا چہرہ قدرے اترا ہوا ہے۔"

اس پر افسر اعلیٰ بولے: "نہیں کوئی بات نہیں، رات کو تو میں سویا رہا ہوں، شکریہ اس کے بعد دوسرے صاحب گئے اور جاتے ہی ان کی صحت کے متعلق استفسار کیا اور تشویش ظاہر کی۔

تیسرے صاحب جب کاغذ اٹھائے کمرے کے اندر قدم رکھا ہی چاہتے تھے کہ افسر اعلیٰ اٹھ کھڑے ہوئے اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

میری طبیعت قدرے ناساز ہے، دستخط پھر سہی۔

"جانتے ہو یہ کیا تھا؟

یہ سب القا (Suggestion) کی شرارت تھی۔

پاگل پن کے کئی مریض ایسے ہیں جو ابتدا میں بالکل معمولی نوعیت کے تھے اور آسانی سے ان کا علاج ممکن تھا۔ مگر دوسرے لوگوں نے انہیں پاگل پاگل کہہ کر لاعلاج

بنا دیا۔

اسی طرح ایک نفسیاتی تجربہ یہ بھی ہے کہ اگر مریض کو یقین دلا دیا جائے کہ وہ بھلا چنگا ہو رہا ہے اور اس کی صحت روز بروز ترقی کر رہی ہے تو وہ یقیناً تندرست ہو جاتا ہے کیونکہ یقین دہانی کے تاثر سے اس کی قوتِ ارادی مضبوط ہوتی ہے اور قوتِ مدبرہ بدن کی پشت بانی ہو جاتی ہے۔

دعا صحت یابی کے سلسلہ میں اگرانقدر خدمات انجام دے سکتی ہے جب مریض خود دعا مانگتا ہے تو خود تاثری سے اُسے تسلی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب دوسرے لوگ اس کی خاطر دعا کرتے ہیں تو بھی اسے القا کے ذریعہ اطمینان اور آرام کی کیفیت نصیب ہو جاتی ہے۔

بیمار کے لئے دعا کرنا ہمدردی کا بہترین انداز ہے۔ اور بیمار سے صرف ہمدردی نصف بیماری کو دور کر دیتی ہے۔ بلکہ بقول عدمؔ

؎ وقت پر ایک لفظ ہمدردی
ابن مریم کا کام دیتا ہے

گذشتہ جنگِ عالمگیر کے موقع پر اتحادیوں نے جنگ جیتنے کی خاطر صرف ہتھیاروں پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ دعاؤں سے بھی کام لیا اور نفسیاتی حربے بھی استعمال کئے۔

برطانیہ عظمیٰ نے القا کے لئے (Victory) (فتح) کے دعائیہ لفظ کی پُرزور اشاعت کی اور V دوی کا حرف ایک علامت امتیاز بن گیا۔

ہماری کئی نفسیاتی بیماریاں ہیں جو محض قوتِ ارادی کے ذریعہ دور ہو سکتی ہیں اور قوتِ ارادی کے لئے دعا سر چشمۂ حیات ہے۔

مگر افسوس نہ تو ہماری قوتِ ارادی مضبوط ہے اور نہ ہم میں استجابتِ دعا کی اہلیت ڈاکٹر الیکسس کیرل (Dr. Alexiscaral) بجا فرماتے ہیں۔

"Prayer is our greatest source of power but it is miserably undeveloped."

دعا ہماری طاقت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ مگر افسوس یہ بری طرح ناآشنائے ترقی ہے۔"

ڈاکٹر موصوف مزید کہتا ہے۔

کوئی انسان دعا سے بڑھ کر زیادہ طاقت ور قوت پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک قوت ہے جو اتنی ہی حقیقی ہے، جتنا کہ کششِ ثقل۔

"ایک طبیب اور معالج کی حیثیت سے میرا یہ تجربہ ہے کہ جب انسان ہر قسم کی دوا سے مایوس ہو جاتا ہے تو دعا اس کا سہارا بنتی ہے۔ اور اس کی ساری پژمردگی اور بیماری کو دور کر دیتی ہے۔

دعا بھی درحقیقت ریڈیم کی طرح ایک روشن اور خود زا قوت کا سرچشمہ ہے۔ انسان بجا طور پر ساری قوتوں کے اس بے کراں اور بے پایاں سرچشمے سے سیراب ہو کر اپنی محدود قوت میں بے حد اضافہ کر سکتا ہے۔ جب ہم دعا مانگتے ہیں تو ہم اپنا رشتہ ایک لازوال تحریکی قوت سے جوڑ لیتے ہیں جو ساری کائنات کو پروتی ہے۔

ہم دعا مانگتے ہیں کہ اس قوت کا ایک جزو ہماری ضرورتوں کے لئے مخصوص ہو جائے۔ یہاں تک کہ عین مانگتے وقت ہماری انسانی کمی پوری ہو جاتی ہے اور ہم مضبوط و توانا ہو کر اٹھتے ہیں۔

جب ہم بے قرار و مضطرب ہو کر خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم اپنے جسم اور روح دونوں کی بہتری کے لئے قدم اٹھاتے ہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص پورے خلوص اور شوق سے دعا مانگے اور اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہ نکلے۔"

فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے چھپے ہوئے خزانوں کا سراغ لگائیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ عرفانِ نفس سے ہم غالب اور سربلند ہو سکتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حکیم اسلام حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرفانِ نفس پر بہت زور دیا ہے۔

آپؓ سے دو شعر بھی منسوب کئے جاتے ہیں جو حکمت سے خالی نہیں اور نفسیات کی دنیا میں بڑی قدر و منزلت کے حامل ہیں۔

دَوَاءُكَ فِيكَ وَمَا تَشْعُرُ

وَدَاءُكَ مِنْكَ وَمَا تُبْصِرُ

تیری دوا تجھ میں مضمر ہے ، مگر تجھے شعور بھی نہیں (اور اسی طرح)
تیری بیماری بھی تجھ سے ہے مگر تو دیکھتا نہیں ۔

۲۔ وَتَحْسَبُ اِنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ
وَفِيكَ انطوى العالم الاكبر

تو ، تو اپنے کو ایک چھوٹا سا جسم خیال کرتا ہے ۔
حالانکہ تجھ میں بہت بڑا جہان سمایا ہوا ہے ۔

قوتِ ارادی کا مرکز دل کو سمجھا جاتا ہے اور غالباً اس امر پر انسانی فطرت کے نباضِ اعظم آنحضرت محمدؐ کی ایک حدیث شریف بھی روشنی ڈالتی ہے ۔ جس میں کہا گیا ہے کہ بدن میں گوشت کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہے ، اگر اس کی اصلاح ہو جائے ، تو سارے بدن کی اصلاح ہو جاتی ہے ۔

اور وہ ———— انسان کا دل ہے ۔





ہمارے نفس (Mind) کی دنیا بھی بہت وسیع ہے ۔ اس کی کئی اقلیمیں ہیں ۔ کہیں شعور (Conscious Mind) کی اقلیم ہے تو کہیں لاشعور کی (Unconscious Mind) کی ولایت کہ جسے دنیائے نفس کے کولمبس ڈاکٹر فرائڈ (Freud) نے دریافت کیا ۔

مزید ہمارے ذہن کا ایک حصہ تحت الشعور (Sub-conscious Mind) کہلاتا ہے ۔ اور یہ ایک قسم کی وہبی، لدنی اور خداداد طاقت کا خزانہ ہے اور اس کا مرکزِ اتصال ۔ قادرِ مطلق کی قدرتِ قاہرہ ہے ۔

اس تحت الشعور پر قابو پا لیا جائے تو بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں ۔

ہمزاد کا وجود اور تسخیر ہو سکتا ہے کہ ایک افسانہ ہو مگر تحت الشعور کے کارنامے زندہ حقیقت ہیں ۔ ایک عام تجربہ جو تحت الشعور کی شعوری قوت پر روشنی ڈالتا ہے ، وہ یہ ہے کہ اگر رات کو کوئی شخص تحت الشعور کو یہ کہہ کر سو جائے کہ اتنے بجے

جگا دینا تو تحت الشعور اسے اسی معیّن وقت پر جگا دے گا۔

یہ تحت الشعور جس طرح سوئے ہوئے انسان کو جگا دیتا ہے، اسی طرح جب ہم دعا مانگتے ہیں تو اس کے ذریعہ ہماری خفتہ رُوحانی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ کام ہو جائے گا۔ اس ضمن میں تحت الشعور کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بھول جائے۔ یا کوئی نام ہمیں یاد نہ آ رہا ہو۔ تو اس کے لئے اس وقت شعوری کوشش بے کار ہوگی اس معاملے کو لاشعور اور تحت الشعور کے سپرد کر دینا چاہیئے، کیونکہ جتنی ہم شعوری کوشش کریں گے، اتنی ہی وہ ضد کرے گا، پس تحت الشعور کے سپرد کرو اور بقول ایمرسن وہ اسے کان سے پکڑ کر لائے گا۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ ایک چیز جو بالکل یاد نہیں آ رہی، کچھ گھنٹوں کے بعد فوراً ذہن میں آ جاتی ہے۔ حالانکہ ہم نے اس کی تلاش ترک کر دی تھی۔

تحت الشعور خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان وسیلۂ قرب ہے۔ اسی کے سہارے ہماری دعائیں شرفِ قبول حاصل کرتی ہیں۔ دعاؤں کی اجابت تحت الشعور کا کرشمہ ہے۔ ہم جب اس کو کسی نیک خواہش کی تحریک (Stimulus) دے دیتے ہیں تو وہ ہمہ تن اسی کے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ سوتے جاگتے، سوچتے رہتا ہے اور آخر کامیابی کی راہیں اس پر کھل جاتی ہیں۔

یاد رہے کہ تحت الشعور دن رات برابر کام کرتا رہتا ہے، حالانکہ ہمیں کبھی احساس تک نہیں ہوتا اور جب ہم اپنا معاملہ خلوص کے ساتھ دعا کے ذریعہ تحت الشعور اور خدا کے سپرد کر دیتے ہیں تو طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے، اور یہی اطمینان دعا کی قبولیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہماری کئی بیماریاں نفس (Mind) کی پیداوار ہیں اور بقول افلاطون بعض بیماریوں کا علاج بھی نفس ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

اُس نے ایک مذہبی رہنما کا تذکرہ بھی کیا ہے جس نے اختناق الرحم (Hysteria) کی مریض عورتوں کا علاج صرف بین بجا کر کیا تھا۔

علاجِ نفسی (Psychotherapy) کی مقبولیت ہمارے دل میں دعا کی قدر و قیمت بڑھائے بغیر نہیں رہتی کہ جس کا اصول یہ ہے کہ اگر نفس میں صحت مندی

پیدا ہو جائے تو انسان نہ صرف بیماریوں سے شفایاب ہو جاتا ہے، بلکہ اس کے آئینہ مسرت میں بھی نکھار آجاتا ہے۔ کثافتیں سب دور ہو جاتی ہیں اور صحت مند عاطفے پرورش پاتے ہیں۔

دعا ہماری ذہنی صحت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور جس قدر بھی نفسیاتی امراض ہیں یہ ان کا بہترین علاج ہے۔ ایک امریکی ماہر نفسیات اے اے برل نے کہا ہے۔

"جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔ جب کہ مذہب میں دعا کو اوّلیت حاصل ہے۔

بلکہ بقول ڈیل کارنیگی، اب تو ماہرین علم امراض النفس محسوس کرنے لگے ہیں کہ دعا اور مستحکم مذہبی عقیدہ پریشانیوں، تشویشوں اور اعصابی کشمکشوں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کی ذمہ دار ہیں۔

احساس کمتری کا مرض بہت عام ہے اس میں مریض اپنے آپ کو حقیر اور ادنیٰ درجے کا خیال کرتا ہے۔ کسی سے بات کرتا ہوا جھجکتا ہے۔ سوسائٹی میں بیٹھنے پھرنے سے گریز کرتا ہے کوئی عہدہ مل جائے یا اسے ذمہ داری سونپ دی جائے تو اپنے کو نااہل محسوس کرتا ہے۔ جب کسی بڑے افسر کے پاس جاکر کوئی بات کرنا ہو تو سارا راستہ سوچتا رہتا ہے اور وہ باتیں دھراتا رہتا ہے جو اسے وہاں جاکر کرنا ہوتی ہیں۔ مگر وہاں پہنچ کر اس کی عجیب کیفیت ہوتی ہے!

یہ ایک ایسا مرض ہے کہ اس کے لئے آج تک کوئی دوا تیار نہیں ہو سکی۔ ایسے موقعوں پر دعا ہی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ جذباتی الجھنوں میں ہمیشہ دوا کی بجائے دعا درکار رہے! ڈاکٹر نارمن ونسنٹ پیل (Norman Vincent Poale) کے نزدیک احساس کمتری کا تیر بہدف نسخہ یہ ہے۔ کہ جب اس احساس کی شدت ہو تو اس وقت دل میں خدا سے دعا مانگ لی جائے۔ دعا مانگتے وقت وہ خوف بھول جاتا ہے جو احساس کمتری کی پیداوار تھا اور انسان کو خود اعتمادی نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ جس ذات سے میں مدد مانگ رہا ہوں وہ سب پر غالب ہے۔

اس برتر ہستی (Supreme Being) کی مدد کے شامل حال ہونے کا جب یقین ہو تو پھر دل میں خوف و ہراس کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

ڈاکٹر موصوف نے کئی کیس بھی گنوائے ہیں جو صرف دعا کے ذریعہ شفایاب ہوئے۔
انسانی معاشرہ میں ملاقات کے وقت سلام کا جو رواج ہے، اس کے پیچھے بھی نفسیاتی حکمت کام کررہی ہے۔ کہ کلام اور بات چیت کی ابتدا دعا سے کی جائے تاکہ احساس کمتری سے پیدا ہونے والے اثرات ظاہر نہ ہوسکیں۔

یاد رہے سلام ایک قسم کی دعا اور خیر سگالی کا مظہر ہے۔

دعا خدا کی معیت اور مدد کی نشاندہی کرتی ہے، اس لئے ہر قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی کے وقت، اس کا اثر خوب ظاہر ہوتا ہے۔

جب انسان کو یاد آجائے کہ خدا اس کے ساتھ ہے تو سب خوف دور اور کافور ہو جاتے ہیں، تاریخ شاہد ہے کہ "ان اللہ معنا" کا یقین نزولِ سکینہ کا باعث بنتا ہے۔
اور یہ معیتِ خداوندی کا یقین ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو انسان اللہ تعالےٰ کا دوست (ولی اللہ) بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ دنیا جہاں کے خوف سے بے خطر ہے۔

صحیفہ الہام —— قرآنِ پاک کے اپنے الفاظ ہیں۔

اِنّ اولیاء اللّٰہِ لاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون

بعض نفسیاتی مریض اور متکبر لوگ دعا مانگنے سے احتراز کرتے ہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ کیونکہ کوئی سلیم الفطرت پڑھا لکھا شخص اس احساس برتری کا شکار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ بذاتِ خود ایک نفسیاتی مرض ہے اور احساسِ کمتری کی تلافی کی غیر طبعی صورت ہے۔
غرضیکہ احساسِ کمتری اور احساسِ برتری دونوں افراط و تفریط کے شاخسانے ہیں اور حدِ اعتدال سے دونوں متجاوز ہیں۔

احساس برتری جسے دوسرے معنوں میں انانیت ایجابی (Positive Egotism) کہا جاسکتا ہے۔ سلبِ ایمان اور حبطِ اعمال کا باعث بھی ہے۔

انسان خدا تعالیٰ کی رحمت سے بے نیاز کیوں کر ہوسکتا ہے؟ انسانی فکر کی درماندگی ظاہر ہے کیونکہ سائنس اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ابھی تک موت و حیات پر قابو نہیں پاسکی اور نہ مستقبل قریب میں اس امر کا کوئی امکان ہے۔

دیکھئے انسان اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ کے سامنے کس قدر بے بس ہے!

یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللّٰہِ واللّٰہ ھوالغنیُّ الحمیدُ (القرآن)

"انسانو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو، لائقِ حمد بے نیاز ذات صرف اسی کی ہے"

انانیت سلبی (Negative Egotism) ایک نفسیاتی الجھن ہے۔ جس میں انسان مایوس ہو کر جمود اور خمود کا شکار ہو جاتا ہے۔

اُردو ادب میں فانی اور میر اور یورپین ادبیات میں ڈی موسے (De Musset) شوپن ہار اور بیتھوون (Beethouen) کی شخصیات اگرچہ عظیم ہیں تاہم ان کے ہاں ان تاثرات کی جھلکیاں عام ہیں۔

خودداری کے خول کے نیچے یاسیت مترشح ہے۔

اس انانیت سلبی کا علاج اور حفظ ماتقدم دعا میں مضمر ہے۔

استجابتِ دعا پر یقین رکھنے والا کبھی یاس کے سامنے سپر انداز نہیں ہو سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے تو پھر مایوسی اور قنوطیت کیسی؟

★ ــــ یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ ۝ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳)

اے اپنے نفسوں پر زیادتی کرنے والے میرے بندو! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

دعا کی سب سے بڑی خوبی اور بہترین ثمر ــــ انقلابِ نفس ہے، کیونکہ اس کے بعد انسان، ظلمت سے نور کی طرف، پستی سے بلندی کی طرف اور ملوثات سے پاکیزگی کی طرف آجاتا ہے۔

نیک خواہشات، حضور قلب اور رب العزت کی بارگاہ میں حاضری کا احساس، مل کر یقیناً انسان کی سیرت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

لہذا روحانی احوال کی نفسیات کے فاضل ولیم جیمز بجا فرماتے ہیں۔ کہ دعا کی صداقت کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ وہ انسان کے باطن میں کچھ نہ کچھ حقیقی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔

ہندو مت کے مسٹر گاندھی اپنی کتاب "تلاشِ حق" میں دعا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:۔

جب مددگار کام نہیں آتے اور سہارے ٹوٹ جاتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہیں سے مدد پہنچی،

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے الحاح وزاری، عبادت، دعا، اوہام نہیں ہیں۔

یہ حقیقی افعال ہیں اور ان میں کھانے، پینے، بیٹھنے، چلنے سے زیادہ حقیقت ہے، اگر یہ کہا جاتے تو مبالغہ نہیں کہ صرف یہی چیزیں حقیقی ہیں اور جو کچھ ہے وہ مجازی ہے۔

یہ عبادت یا دعا خطابت کا طوفان نہیں، محض زبانی طاعت اور بندگی نہیں، یہ وہ چیز ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اگر ہم تزکیہ قلب کی اس منزل پر پہنچ جائیں کہ دل "سوائے محبت کے ہر چیز سے خالی ہو" اگر اس کے سب تار کسے ہوئے ہوں تو ان کی لرزش نغمہ بن کر حدِ نظر سے آگے چلی جاتی ہے، دعا کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں، وہ بجائے خود سعی محسوس سے مستغنی ہے۔ مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں کہ دعا دل کو شہوانی جذبات سے پاک کرنے کے لئے اکسیر ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ انتہائی عاجزی بھی ہو"

فیلسوفِ اسلام علامہ اقبالؒ دعا کو روحانی علم کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اور مزید فرماتے ہیں۔ دعا خواہ انفرادی ہو، یا اجتماعی، ضمیر انسانی کی اس نہایت پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے یہ انکشاف و تجسس کا وہ عدیم المثال ہے جس میں طالبِ حقیقت کے لئے نفیٔ ذات ہی کا لمحہ اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے۔ اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہو کہ بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت حیاتِ کائنات میں ایک فعال عنصر کی ہے۔

ڈیل کارنیگی (Dale Carneige) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں جن کی حیات آموز تصانیف قبول عامہ حاصل کر چکی ہیں۔ دعا کی افادیت کے متعلق وہ رقمطراز ہے۔

اگر آپ فطرت یا تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مذہبی آدمی نہ بھی ہوں اور اگر آپ سراسر کلبیت اور لا ادریت پسند ہوں۔

تو پھر بھی دعا آپ کی توقع اور یقین سے زیادہ آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ عملی چیز ہے، عملی کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری تین بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں خواہ خدا پر ایمان رکھتے ہوں یا نہ۔

ا۔ ہم پریشان اور مضطرب کیوں ہیں؟

دعا اس کا جواب الفاظ میں بیان کرنے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ غیر واضح اور

مبہم مسئلے سے نپٹنا ناممکن ہوتا ہے ایک اعتبار سے دعا اپنے مسئلے کو کاغذ پر لکھنے کے مترادف ہے۔ جب ہم اپنے کسی معاملے میں مدد مانگتے ہیں۔ خواہ وہ خدا سے ہی کیوں نہ ہو، اسے مناسب الفاظ میں بیان کرنا ضروری اور ناگزیر ہے۔

۲۔ دعا ہمیں اکیلے نہ ہونے اور اپنے بوجھ کو بٹانے کا احساس دلاتی ہے۔ ہم میں سے بہت کم لوگ اتنے طاقت ور ہیں کہ ہماری بھاری بوجھ اور سخت سے سخت تکلیفوں کو اکیلے برداشت کر سکیں۔

بعض اوقات ہماری پریشانیاں اس قدر داخلی اور شخصی نوعیت کی ہوتی ہیں کہ ہم ان کا اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتے داروں سے بھی ذکر نہیں کر سکتے۔ پھر دعا ہی ہمارے پاس ایک آخری وسیلہ رہ جاتا ہے، ہر ایک ماہر امراض النفس آپ کو بتائے گا کہ جب ہمارے اعصاب میں کھینچا تانی ہو رہی ہو۔ ہمارا گلا گھٹ رہا ہو۔ یا ہم کسی روحانی کرب میں مبتلا ہوں تو ہم کسی سے اپنی تکالیف و مشکلات کا ذکر کر کے بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم دوسروں کو اپنا بھید نہیں بتا سکتے، تو خدا کو تو دعا کے ذریعہ بتا سکتے ہیں۔

۳۔ دعا "کرنے" کے عملی اصول کو بروئے کار لاتی ہے اور یہ عمل کی طرف پہلا قدم ہے "مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص اپنے کسی کام کی تکمیل کے لئے دعا مانگے اور پھر عملی قدم نہ اٹھائے

غرض یہ کہ :۔

دعا اپنے دامن میں بے شمار خوبیاں رکھتی ہے۔ چنانچہ سب مذاہب نے اس کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو کہ جس نے دعا کی ترغیب نہ دی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتابوں میں مختلف طریقوں سے دعا کی ترغیب دی ہے اور قبول کرنے کا حتمی وعدہ بھی فرمایا ہے۔

صادق چلاتے ہیں اور خداوند سنتا ہے
اور انہیں سارے دکھوں سے رہائی دیتا ہے
خداوند ان کے نزدیک ہے کہ جو شکستہ دل ہیں۔ عہد نامہ عتیق زبور ۳۴: ۱۷-۱۸)

○ — مانگو، تو تمہیں دیا جائے گا۔
ڈھونڈو، تو تم پاؤ گے۔
دروازہ کھٹکھٹاؤ، تو تمہارے لئے کھولا جائے گا۔
کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اُسے ملتا ہے۔ اور
جو ڈھونڈتا ہے، وہ پاتا ہے۔

عہد نامہ جدید انجیل متی (۷/۷)

○ — اَمَّن یجیبُ المضطرَّ اذا دعاہ ویکشفُ السُّوٓءَ (القرآن ۲۷/۶۲)
پریشان حال کی پکار کون سنتا ہے؟ اور کون مصیبت دُور کرتا ہے؟

○ — اُجیبُ دعوۃَ الداعِ اذا دعانِ فلیستجیبوا لی (۲/۱۸۶)
پکارنے والے کی پکار کو میں سنتا ہوں جس کسی وقت وہ پکارتا ہے۔
پس انہیں چاہیئے کہ میری پکار کا جواب دیں اور میرے احکام کی تعمیل کریں۔

○ — واذا سالکَ عبادی عنّی، فانی قریبٌ۔ ۲/۱۸۶
اے رسول اکرم! جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں (کہ خدا کہاں ہے ہماری دعا وہاں تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں؟) تو کہہ دیجئے گا، میں تو بالکل قریب ہوں۔

○ — وقالَ ربُّکمُ ادعُونی اَستَجِب لکُم ۴۰/۶۰
تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھے پکارو۔ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

○ — وسئَلوا اللّٰہِ من فَضلِہٖ ۴/۳۲
ہاں! اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو۔

○ — فاذکرونی اذکُرکُم واشکرُوا لی ولاتکفرون ۲/۱۵۲
تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا، میرا شکر ادا کرو اور ناشکرے نہ ہو۔

قرآن پاک میں سورہ فاتحہ پورے قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ ہے اور معارفِ قرآن کے لئے تمہید کا کام دیتی ہے اس کا نصف حصہ دعا پر مشتمل ہے۔ بلکہ یہ سورہ ہی سورۃ دعا کے نام سے موسوم ہے اور دعائیہ وصف کی وجہ سے اس کے آخر میں "آمین" کا اضافہ کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اور کسی سورت کے آخر میں یہ التزام نہیں

ہے۔ مزید برآں یہ سورت ہر نماز بلکہ ہر رکعت میں پڑھنا ضروری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری نماز بھی ایک طرح کی دعا ہی ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی آیت قرآن پاک کی پہلی آیت اور ہر سورہ کے ساتھ دہرائی جانے والی تمہیدی آیت ہے۔ وہ بھی ایک دعا ہے۔

اسلام نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت بسم اللہ کی دعائیہ آیت کی تلاوت کر لینی چاہیئے۔ اس کی تلاوت سے نہ صرف کام میں برکت ہو گی۔ بلکہ پڑھنے والا کوئی ناجائز کام کرتے ہوئے پرہیز کرے گا، کیونکہ بُرا کام اللہ تعالےٰ کے نام سے شروع کرتے ہوئے اسے خجالت محسوس ہو گی۔ اس طرح وہ ارتکاب گناہ سے بچ رہے گا۔

اسلام نے سلام پر بھی بہت زور دیا ہے۔ اور یہ ایک دعائے خیر ہے۔ گویا ایک دوسرے سے ملتے وقت دعائے خیر کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح افشائے سلام انسان دوستی اور خیر سگالی کا بہترین ذریعہ ہے۔

آنحضرت صلعم خود اکثر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بقول عیسائی مورخ ٹامس کارلائل آخری الفاظ جو آنحضرت کی زبان سے نکلے، ایک دعا ہے۔

ایک قلب مضطر کے اپنے خالق کے حضور چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یعنی دمِ آخرین آنحضرت کی زبان پر اَللّٰھُمَّ بالرفیق الاعلیٰ کے الفاظ تھے۔

کتاب اللہ نے انسانوں اور جنات کا مقصدِ تخلیق عبادت قرار دیا ہے۔

سنتِ رسول اللہ نے واضح کیا ہے کہ دعا، عبادت کا جوہر ہے۔ دعا کی عظمت کا اعلان کرتے ہوئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے (بروایت ابوہریرہ رض) فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی چیز زیادہ باعظمت نہیں"

(ترمذی ابن ماجہ)

آنحضرت ؐ نے استجابتِ دعا کے منازل اور حدود بھی معین فرمائے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ جو مسلمان دعا مانگے اور اس میں کوئی ایسی دعا نہ ہو جس میں گناہ یا قرابت داری کے انقطاع کا ذکر ہو۔ تو خدا دعا مانگنے والے کو ان تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا فرما دیتا ہے۔

۱۔ (یا تو) اس کا مقصد جلد پورا کر دیتا ہے۔

۲ — (یا) اس کی دعا کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا رکھتا ہے۔

۳ — (یا) دعا مانگنے والوں کی کوئی ایسی ہی یا اتنی ہی برائی دور کر دیتا ہے۔ جتنی کہ اس نے دعا میں نفع کی خواہش کی تھی۔

یہ سُن کر صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم) نے عرض کی۔ "اب تو ہم بہت دعا کیا کریں گے۔

آنحضرت ؐ نے فرمایا! ہاں کیا کرو، اللہ تعالیٰ کا فضل بہت ہی زیادہ ہے (مسند احمد)

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ؐ نے فرمایا تم خداوند تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا کرو اس لیے کہ خداوند تعالیٰ مانگنے کو بہت پسند کرتا ہے اور بہترین عبادت کشادگی کا انتظار کرتا ہے۔ (ترمذی)

حدیث قدسی ہے یاعبادی لو ان اوّلکم واٰخرکم وانسکم وجنکم قاموا فی صعید واحد فسالونی فاعطیت کل واحد مسئلته مانقص ذالك مما عندی الا کما ینقص المخیط اذا دخل البحر (صحیح مسلم)

ترجمہ:۔ اے میرے بندو! بے شک اگر تمہارا پہلا شخص اور آخری شخص، تمام انسان اور جنات ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور پھر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر ایک کو عطا کر دوں جو کچھ اس نے مانگا ہو تو بھی میرے خزانۂ قدرت میں اتنی بھی کمی نہیں ہو گی جتنی سمندر میں سوئی ڈبو لینے سے ہوتی ہے۔

آنحضور سرورِ کائنات ؐ نے اس امر کی بھی تلقین کی کہ چھوٹی چھوٹی حاجتوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ حتیٰ کہ خواہ وہ نمک مانگنا ہو یا جوتی کا تسمہ، جبکہ وہ ٹوٹ جائے۔

اس طرح سے دعا ہماری زندگی کے لمحے لمحے کی ساتھی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے، تو بزرگ دعا کرتے ہیں اور پھر زندگی میں قدم قدم پر دعا ہمارا سہارا بنتی ہے بلکہ عالم برزخ اور اگلے جہاں میں بھی دعائیں ہمارے لبوں پر ہوں گی اور ترقی مدارج کا باعث بنیں گی۔

○ ——— دعوٰهم فیها سبحانك اللّٰهمّ وتحیّتهم فیها سلام ○ (القرآن)

ہمارے اسلاف بہت نیک طینت بزرگ تھے وہ بچوں کے دلوں میں دُعا کی فضیلت جاگزین کر دیا کرتے تھے۔

چنانچہ تاریخ میں ایک پیاری روایت ملتی ہے کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ

اپنے عہدِ خلافت میں بھی جب بازار میں نکلتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچے جو ان سے مانوس ہو گئے تھے وہ دوڑ کر آجاتے اور دامن تھام کر کہتے۔

"اے ہمارے پیارے بزرگ باپ! ہمیں دعا دیجئے۔"

اور آپ پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور دعائیں دیتے۔

باب دوم

اِسلام کا تصوّرِ دُعا

اسلام فطرت کے مطابق بالکل سیدھا سادا دین ہے اس میں تکلّفات کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ دُعا کے متعلق جو تکلّفات دیگر مذاہب کے دُنیادار راہنماؤں نے قائم کر رکھے تھے اس نے ان کو دُور کر دیا اور ان پردوں کو ہٹا دیا کہ جو دُعا کے روئے حقیقت پر پڑے ہوتے تھے۔ مذہب جب رسومات اور تکلّفات کا گورکھ دھندا بن جاتے۔ تو نہ صرف اپنے ماننے والوں کے لیے تکلیف اور مصیبت کا باعث بن جاتا ہے، بلکہ اوروں کے لیے بھی تلاش حق میں بڑی تکلیف ہوا کرتی ہے اور جو لوگ توہمات اور اصل دین میں امتیاز نہیں کر پاتے، وہ غلط راستے قائم کر لیتے ہیں۔

بعض فلاسفر مثلاً برکلے (Berkely) ہیوم (Hume) لاک (Lock) مل (Mill) اور مجذوب فرنگی نطشے (Neitzache) وغیرہ اسی حادثے سے دو چار ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے اصل مذہب اور دعا کو رسومات اور توہمات سے الگ کر کے نہیں دیکھا تھا۔

نیز دُعا کے متعلق اسلام کا پیش کردہ پاکیزہ تصوّر بھی ان کے پیش نظر نہ تھا۔

۱۔ دُعا میں تکلفات حسب ذیل تھے۔

ا۔ پروہتائی نظام

دُعا دراصل بندے اور خُدا کے درمیان بالمشافہ عرض و معروض کرنے کا نام ہے۔ لیکن پنڈتوں اور پادریوں نے اپنی اہمیت بڑھانے کی خاطر اس امر کا پرچار کیا کہ پنڈت اور پادری درمیانی واسطہ ہیں اور ان کے بغیر دعا خدا تک نہیں پہنچ سکتی۔ چنانچہ ہندومت میں پنڈتوں نے اور عیسائیت میں پادریوں نے دعا پر اجارہ داری قائم کر کے عوام کی سادہ لوحی سے خوب فائدہ اٹھایا۔

وَهَل اَفسَدَ الدینَ اِلّا الملوک
واحبار سُوءٍ وَّ رهبانها

(ابن المبارک)

ب۔ قربانی

جب مذاہب میں پروہتائی آگئی تو دُعا کو غیر ضروری تکلّفات کا دست نگر بنا دیا گیا۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے مطابق دُعا کے ساتھ قربانی، ہون اور یگیہ وغیرہ ضروری قرار دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں یہ کیفیت ہو گئی کہ راجے مہاراجے بھی قربانی کی ان شرائط کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ بعض جگہوں پر تو انسانی خون کی بھی قربانی دی جاتی تھی

اسرائیلی عہد بھی بڑی بڑی قربانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب کہ دُعا اس وقت تک قابلِ قبول نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ قربانی نہ کی جاتے اور قُربانی کے قبول ہونے کا اس وقت تک یقین نہیں آتا تھا جب تک کہ ایک خاص قسم کا پرندہ ظاہر نہ ہو یا بجلیاں آکر اُسے جلا نہ جائیں۔

حضرت مسیح ناصری ؑ نے فریسیوں اور فقیہوں کی خوب خبر لی کہ جنہوں نے دعا اور عبادت کو تکلّفات کا گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔

مگر دنیا سے آپ کے اُٹھتے ہی عیسائیوں میں بھی وہی تکلّفات عود کر آتے جن کے خلاف حضرت مسیح ؑ سراپا احتجاج رہتے تھے۔

رواقیوں کے ہاں بھی بے جا قربانیوں کا زور تھا۔ چنانچہ زینو نے اس کی پرزور مخالفت کی۔

ج۔ خاص مقام دُعا

اسلام سے پہلے دعا خاص مقامات مثلاً گرجے، صومعے اور مندر وغیرہ میں مانگی جاسکتی تھی۔ رواقیوں کے ہاں بھی یہی کیفیت تھی کیونکہ ان کے مصلح فلسفی زینو نے اس کی مخالفت کرتے ہوتے انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا کے فاضل مقالہ نگار کے الفاظ میں کہا۔

"A really acceptable prayer can only have reference to a virtuous and devote mind, God is best worshipped in the shrine of heart by the desire and to obey Him."

دُعا اور عبادت صرف نیک، پاکباز اور خدارسیدہ انسان کی قبول ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بہترین عبادت من کے مندر میں ممکن ہے نہ کہ عام اینٹ پتھر کے مندروں میں، عبادت بس وہی ہے جس میں عرفانِ حق اور اطاعت کا پرخلوص جذبہ کارفرما ہو۔

تکلفات کے بعد دعا کے معاملے میں جو سب سے بڑی زیادتی روا رکھی گئی وہ شرک تھا۔

۲۔ شرک:۔

دعا تو محض خدا سے مانگی جانی چاہیئے۔ مگر جس طرح پروہت اور پنڈت درمیان میں وسیلہ بن بیٹھے تھے، اسی طرح لوگوں نے پتھر کے بت بھی بنالیے، اور پھر بتوں سے مرادیں مانگی جانے لگیں۔ حالانکہ نہ وہ کسی کا کچھ بنا سکتے ہیں اور نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ان بتوں کو اپنا سفارشی اور وسیلہ سمجھتے تھے گویا بھینس کے آگے بین بجاتے تھے۔

۳۔ ترکِ عمل اور محض دُعا پر انحصار

جس طرح لوگوں نے شرک کرکے دُعا کا غلط استعمال کیا۔ اسی طرح دُعا کے معاملے میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ لوگوں نے عمل سے ہاتھ اُٹھا لیے۔

درود و وظائف کو مدارِ حیات بنا کر لوگوں نے مالائیں جپنا شروع کر دیں اور اس طرح عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

عیسائیت میں رہبانیت اور ہندو مت میں سنیاس داخل ہو گئے ان کی دعائیں اس شخص کی دعاؤں کی طرح تھیں کہ جو پیاسا ہو اور چشمے سے دُور بیٹھ کر آرزو کرے اور دُعا مانگے کہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جاتے۔

کیا اس طرح پانی اس کے منہ تک پہنچ سکتا ہے؟

۴۔ دُعا سے سنتِ الٰہی کے خلاف توقعات:۔

اللہ تعالیٰ کا ایک قانونِ فطرت ہے۔ جس میں تبدیلی ممکن نہیں، دُعا کی افادیت مسلّم مگر اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلینا اور عمل کو چھوڑ دینا کسی طرح درست نہیں۔ معجزات انبیا علیہم السلام سے تو ممکن ہیں مگر ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

عیسائیت میں بھی دُعا کے تصور کے ساتھ مافوق العادت عنصر وابستہ ہوگیا تھا۔ لہٰذا فرانسیسی مصلح (والٹیر متوفی ۱۷۷۸ء) نے اپنے عہد میں دعا کو اس عنصر سے صاف کرنے کی کوشش

کہ نتیجتاً حقیقی دُعا یہ نہیں کہ آدمی سنتِ الٰہی (Law of Nature) کی خلاف ورزی کی خواہش کرے بلکہ حقیقی دعا تو یہ ہے کہ جس میں قانونِ فطرت کو اللہ تعالیٰ کی نہ تبدیل ہونے والی مشیّت اور رضا کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

اسی طرح جرمن فلاسفر کانٹ (Kant) (وفی ۱۸۰۴ء) نے یہ سوال اُٹھایا کہ دُعا اگر اُن قوانینِ قُدرت کے تعطل کا باعث بنتی ہے جن پر سارے تجربات کا مدار ہے۔ تو یہ بے فائدہ ہے۔ ورنہ نہیں)۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ سراسر توہمات کے خلاف ہے اور اس نے نوامیس فطرت کے صحیح تصور دلانے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ذیل کا تاریخی واقعہ اس امر پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کی وفات ہوئی تو اس وقت اتفاق سے سورج کو گہن لگ گیا تھا۔ اس پر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ گہن حضرت ابراہیمؑ کی وفاتِ حسرت آیات کی وجہ سے لگا ہے اور اس طرح سے آسمان نے اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔

آنحضرتؐ کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ کسی انسان کی وجہ سے چاند سورج کبھی نہیں گہناتے۔

اسلام آیا تو اس نے دور از کار تکلفات کی پوری کانٹ چھانٹ کی۔ انسان کے کندھوں سے اس تکلیف کا بار ہلکا کیا کہ جس کی وجہ سے انسانیت پسی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا تصور کراتے ہوئے قرآن پاک نے اعلان کیا کہ یہ نبی الامی وہ ہے کہ جو

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)

لوگوں سے ان کے بوجھ اتار دیتا ہے اور ان طوقوں کو بھی اتار پھینکتا ہے جو ان کی گردن میں پڑے ہوئے تھے۔

اسلام میں دعا عابد اور معبود کے درمیان بالمشافہ گفتگو ہے اس میں کسی غیر کے وسیلے کی ضرورت نہیں۔ کسی خاص زبان میں اور کسی خاص مقام پر دعا مانگنا بھی ضروری نہیں۔ کیونکہ خُدا ہر جگہ موجود ہے۔ جہاں، جس جگہ اور جس وقت انسان چاہے، دعا مانگ سکتا ہے۔ اسلام نے تو عبادت کے لیے بھی مساجد کی شرط ضروری نہیں سمجھی۔ بلکہ تمام سرزمین

کو جائے عبادت قرار دے دیا ہے اسلام میں پروہت (Priest-hood)
کی بھی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ اس دینِ حق میں آسانی ہے۔ تکلیف نہیں، یُسر ہے، عسر نہیں۔ سہولت ہے اور تنگی نہیں۔

ذالِكَ فضلُ اللهِ يُؤتيهِ من يشاء

دُعا سے متعلق اسلام میں جو شرائط بیان کی جاتی ہیں وہ استجابتِ دعا میں ممد ضرور ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کے بغیر دعا قبول ہی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ مجیب الدعوات ہے، وہ ہر شخص کی دعائیں سنتا ہے، نیک کی بھی اور گنہگار کی بھی، اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کی دعا سنتا ہے۔ خواہ وہ بلند آواز سے پکارے یا آوازِ خفی کے ساتھ، کیونکہ وہ سمیع اور علیم ہے یعنی دعاؤں کا سننے والا اور دلوں کے ارادوں، خواہشوں اور وارداتوں کا جاننے والا ہے۔

وُہ انسان سے دور نہیں بلکہ شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وہ دعاؤں سے اُکتا نہیں جاتا بلکہ جب کوئی نہ مانگے تو ناراض ہوتا ہے۔

حضرت ابُوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو شخص خُدا سے سوال نہیں کرتا۔ خدا اس سے ناراض ہو جاتا ہے (جامع ترمذی)

کسی عربی شاعر کے مطابق،

اللهُ يَغضِبُ اِنْ تَرَكْتَ سَوالَهُ

وَابنُ ادم حينَ يُسْال يَغضِبُ

(اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناخوش ہوتا ہے اور انسانوں سے کچھ مانگا جائے تو وہ بگڑتے ہیں)

کثرتِ سوال اس کے خزانے میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتی۔ وہ ایسا کریم ہے کہ بن مانگے بھی دیتا ہے۔ اور حیا کرتا ہے اپنے بندے سے کہ جب وہ ہاتھ اُٹھائے اور ان ہاتھوں کو خالی پھیر دے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن شرک یعنی اس کے علاوہ کسی اور کو پکارنا اسے قطعی پسند نہیں۔

اسلام نے توحید اور ردِ شرک پر بہت زور دیا ہے بلکہ قرآن نے اپنا تمام زورِ بیان اسی مسئلہ پر صرف کیا ہے کہ خُدا ایک ہے اور صرف اسی کو پکارنا چاہیے۔ بتوں سے مرادیں مانگنا عبث ہی نہیں بلکہ نجاتِ آخروی سے محروم کرنے والا گناہ ہے۔

جو لوگ ماسوائے اللہ یعنی مٹی اور پتھر کے بتوں سے دعائیں مانگتے ہیں، وہ حقیقت میں سطحِ انسانیت سے گرے ہوتے ہیں۔ ان کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ وہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے ہیں۔

یاد رہے قرآن پاک صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے والوں کو انسان کہا ہے۔ اسی طرح اسلام میں رہبانیت (Monasticism) بھی نہیں۔ کیونکہ پیغمبرِ اسلام نے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ

لا رُھبانیۃ فی الاسلام

اسلام کا تقاضا ہے کہ انسان دعا بھی مانگے اور کام بھی کرے۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ تنازع للبقا کا بازار گرم ہے اور یہاں بقا اصلح کا ازلی اور ابدی قانون جاری و ساری ہے۔ حرکت ہی میں برکت ہے۔

واقعی اگر سیلِ حیات میں حرکت نہ رہے تو زندگی، گندگی کا جوہڑ بن کر رہ جاتے۔ عملی زندگی سے فرار، حقائقِ حیات کا منہ چڑانا ہے اور اپنی بے مائیگی کا بدترین اعتراف

ے گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
نہیں شکست اگر تو اور کیا ہے شکست! (اقبالؒ)

اسلام فطری تقاضوں کا ساتھ دینے والا مکمل دین ہے اس لیے اس میں دُعا سے متعلق غلط رجحانات کی پوری روک تھام کر دی گئی ہے۔

آنحضرتؐ نے جس دعا پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس میں دُنیا اور آخرت کی بھلائی کی خواہش کی گئی ہے۔ گویا اسلام میں دنیا اور آخرت دونوں اہم ہیں۔ دُعا کے اسلامی تصور کی وضاحت کے لیے قرآنی دعاؤں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ پوری شرح وبسط کے ساتھ قرآنی دعاؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ازالۂ اشکال

بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ دُعا مانگنا، توکّل اور تقدیر کے معارض ہوگا۔ لیکن حقیقتِ حال یہ نہیں ہے۔

توکّل دُعا سے روکتی نہیں بلکہ ترغیب دیتی ہے، درحقیقت حالات کی ناسازگاری کے باوجود خُدا کی مدد پر بھروسہ رکھنے کا نام توکل ہے اور تائیدِ الٰہی کے لیے دعا از بس ضروری ہے۔ قرآن مجید میں جن بزرگوں کی دعائیں وارد ہوئیں، وہی دین حق کے دست و بازو ہیں اور وہ توکّل علی اللہ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ استجابت دعا کے لیے توکّل ایک ضروری شرط ہے۔

خُدا پر کامل بھروسہ ہوگا تو دُعا بھی قبول ہوگی ورنہ نہیں۔

چنانچہ اصحابِ موسیٰ اپنی دعاؤں میں اس امر پر بخوبی روشنی ڈالتے تھے۔ کیونکہ اُنہوں نے اپنے توکّل کا اعلان کر کے اور اسے حجت بنا کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعا مانگی ہے۔ ان کی دعا یہ ہے کہ

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ
وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ القرآن ۱۰/۸۵-۸۶

تقدیر کا تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس میں تقدیر کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ تقدیرِ مُبرم — نہ ٹلنے والی
۲۔ تقدیرِ مُعلّق — ٹلنے والی

تقدیرِ مُبرم میں تو تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ مگر تقدیرِ معلق مشروط ہوتی ہے۔ کہ اگر صدقہ خیرات یا دوا دارو یا دُعا وغیرہ کر لی گئی تو وہ تقدیر بدل جائے گی وگرنہ نہیں۔

مثلاً بیماری کی عمر جو تقدیرِ معلّق کے حساب میں لکھی ہوگی وہ مشروط ہوگی اور جس چیز (دوا، دُعا یا صدقہ) سے مشروط ہوگی اگر وہ شرط پوری کر دی گئی تو بیماری ٹل جائے گی اور اس کی عمر بڑھ جائے گی۔

ارشادِ قُدرت بھی ہوتا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝٣٩

اللہ تعالیٰ کے ہاں محو و اثبات کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے اس کے دستِ قدرت کھلے ہوئے ہیں، بند نہیں۔

یہودیوں کے عقیدے کے مطابق وہ اب (نعوذ باللہ) بے کار محض نہیں بلکہ اس کی شان وَکُلَّ یومٍ ھو فی شان ہے۔

دعا ہم اسی طرح کرتے ہیں کہ اگر محو و اثبات دعا سے مشروط ہوگا تو ہم نے یہ شرط پوری کر دی ہوگی۔

ویسے بھی دُعا اور دوا، امید اور رجا کے آئینہ دار ہیں۔ ان کو کام میں لانے والا ہمیشہ چوکنا رہتا ہے۔ اور کبھی بے کار اور بے عمل نہیں بنتا۔

(تقدیر کا جامد تصور انسان کو قانع نہیں بلکہ قنوطی بنا دیتا ہے اور قنوطیت دینِ فطرت میں کفر کے مترادف ہے۔)

تقدیر اور تدبیر کی یہ اشکال عہدِ رسالت مآب میں بھی پیدا ہوتی تھیں اور اسی وقت اس کا ازالہ کر دیا گیا۔

چنانچہ ابنِ خزامہؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ! یہ تو فرمائیے ہم جو منتر پڑھواتے ہیں۔ جو دوا دارو کرواتے ہیں اور اپنے بچاؤ کی جو تدبیریں (مثلاً لڑائی میں ڈھال، زرہ) یہ چیزیں کیا خدا کی تقدیر کو بدل دیتی ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔" یہ چیزیں بھی تو تقدیر میں شامل ہیں۔

(مسند احمد، ترمذی، ابنِ ماجہ)

دُعا کے متعلق آنحضرتؐ نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ

"دُعا قضا اور بلا کو رد کر دیتی ہے"۔

اس امر پر بے شمار شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں کہ دعا، تقدیر کے قطعاً معارض نہیں۔ مثلاً: انبیاء کرام کو یقینی علم تھا کہ ان کا ٹھکانہ جنت ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ اپنے لیے جنت کا سوال کرتے رہے۔

انہوں نے تدبیر و دُعا کو نہ کبھی خود ترک کیا اور نہ دوسروں کو ترک کرنے کی اجازت دی۔

صحابہ کرامؓ میں سے عشرہ مُبشرہ کو آں حضرتؐ نے جنت کی بشارت دے رکھی تھی، مگر وہ کبھی عمل سے غافل نہیں ہوئے۔

حسنینؓ کہ جنہیں آنحضرتؐ نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا وہ ہمیشہ دست بدعا رہے اور تدبیر و عمل کو کبھی ترک نہیں کیا۔

خاتُونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو جنہیں سیدۃ النساء العالمین کا لقب ملا۔ ہمیشہ نجات اُخروی کے عمل کرتی رہیں۔

ان سب بزرگوں کی زبان پر وَقِنا عذاب النّار کے الفاظ رہے ہیں۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ یہ دنیا دار العمل ہے اور یہاں بندے کو بیم و رجا کی کیفیت اور حالت میں رکھنا منشاء الہی ہے۔ اسی لئے تقدیر کو پوشیدہ اور مخفی رکھا گیا ہے تاکہ بندہ اُمید اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ زندگی گزارے اور جد و جہد کو ترک نہ کر دے۔ اس سعی و عمل کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سعی و عمل تقدیر الہی کے لئے ظاہری سبب بن جاتے ہیں اور یہی ظاہری اسباب تقدیر کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی عملی صورت گری کرتے ہیں۔ دعاء مانگنا دراصل خدا کے سامنے اپنی عبودیت و مسکنت، عجز و نیاز اور فقر و احتیاج کا اظہار ہے اور اس امر کا اعلان ہے کہ دُعا مانگنے والا اپنے آپ کو خدا کے فضل و کرم کا محتاج سمجھتا ہے۔ دعا نہ مانگنا اپنے آپ کو بڑا اور بے نیاز سمجھنے کا نشاخسانہ ہے

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بالعموم لوگوں کے جواب سوال کرتے پر عطا فرمائے ہیں لیکن دعاء کے معاملے میں از خود پہلے ہی سے جواب مرحمت فرما دیا ہے۔

وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ۔ اس آیت میں قرب خداوندی کی جو نشاندہی ہے وہ بھی بے مثال ہے یہ نہیں فرمایا کہ وہ بندے میرے قریب ہیں بلکہ فرمایا کہ میں ان کے قریب ہوں۔ (تفسیر کبیر)

باب سوم

قبولِ دُعا کے طریق

رحمت باری تعالیٰ پر ایمان

قبولِ دُعا کے لیے رحمتِ یزدان پر ایمان ضروری ہے جس قدر اس کی رحمتِ عامہ پر یہ ایمان اور ایقان زیادہ راسخ ہو گا اسی قدر دعا جلد قبول ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کی کتابیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں :-

جو کچھ تم دعا میں ایمان کے ساتھ مانگو گے، وہ سب کچھ تمہیں ملے گا۔

(انجیل متی ۲۱/۲۲)

بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے مزید یہ بھی فرمایا :-

خُدا پر ایمان رکھو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی اس پہاڑ سے کہے تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ اور وہ اپنے دل میں شک نہ کرے بلکہ یقین کرے کہ جو وہ کہتا ہے، وہ ہو جائے گا تو اس کے لیے وہی ہو گا۔

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تم دعا میں مانگتے ہو یقین کرو کہ تم کو مل گیا اور وہ یقیناً تم کو مل جائے گا۔

جب کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے بلکہ یقین اور پوری اہلیت کے ساتھ دُعا مانگے کیونکہ خدا جو چیز عطا فرماتا ہے اس کا عطا کرنا اس کے لیے دشوار نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم)

قرآن کریم نے بھی قبول دعا کے لیے دینی خلوص کا ہونا ضروری قرار دیا ہے اور یہ دینی اخلاص رحمتِ الٰہی پر ایمان ہی کا پر تو ہے۔ لیکن استجابت محض نیکوں کے لیے مختص نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے گنہگار بندوں کی دعائیں بھی شرفِ قبول حاصل کیے بغیر نہیں رہتیں۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ان کی خاطر بہت عزیز ہے۔

بستی بستی، قریے قریے ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے، کرۂ ارض پر کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں کوئی پیغمبر نہ آیا ہو۔ کچھ پیغمبر تو شہید ہوتے اور کچھ گھر سے بے گھر بعض کے جسدِ مبارک آرے سے چیرے گئے اور بعض کے لیے سولیاں تیار ہوئیں۔ مگر اس کے باوجود رحمت کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ بخشش کی راہیں سونی نہیں ہوتیں۔

اُمید اور رجا کی پُر نور قندیلیں لیے یہ مقدس راہیوں کے قافلے
چلتے ہی رہے ....

یہ سارا اہتمام کس غرض سے تھا؟ گنہگاروں کے لیے نہیں تو اور کس کے لیے؟
اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک گنہگار کا توبہ کر لینا اور رحمت کی طرف رجوع کرنا، پاکباز کی عبادتِ صد سالہ سے کہیں عزیز ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے تمثیل کے رنگ میں اسی حقیقت سے پردہ ہٹایا ہے۔

"تم میں سے کون ایسا آدمی ہے جس کے پاس سو بھیڑیں ہوں اور ان میں سے ایک کھو جائے تو ننانوے کو بیابان میں چھوڑ کر، جب تک مل نہ جائے ڈھونڈتا نہ رہے۔ پھر جب مل جاتی ہے تو وہ خوش ہو کر، اُسے کندھے پر اُٹھا لیتا ہے اور گھر پہنچ کر دوستوں اور پڑوسیوں کو بلاتا اور کہتا ہے۔

" دوستو! آؤ میرے ساتھ خوشی کرو۔ کیونکہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مل گئی ہے۔!"

میں تم سے کہتا ہوں کہ اسی طرح ننانوے راست بازوں کی نسبت کہ جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے باعث آسمان پر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔" (انجیل لوقا $\frac{۱۵}{۸،۴}$)

صحفِ سماویہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ رحمت کا دریا لپک لپک کر اپنے کناروں سے، اس شخص کی راہ دیکھ رہا ہے کہ جو اس کا متلاشی ہو، پیاسا ہو۔ قُدرت خود مانگنے کے طریقے سکھاتی ہے، صرف طریقے ہی نہیں بلکہ لکھا لکھایا مضمون بھی۔

انسانی تاریخ ہبوطِ آدمؑ ۔ یعنی پہلے تاریخی ترکِ اولیٰ (لغزش) سے شروع ہوتی ہے۔ بے کسی اور بے بسی میں ابو البشر کی نگاہیں، رحمتِ خداوندی کی طرف اُٹھتی ہیں۔ نگاہوں کے اُٹھنے کی دیر تھی کہ رحمت آگے بڑھ کر دست گیری کرتی ہے۔

آدمؑ نے کلماتِ مغفرت سیکھنے کی طلب کی اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

(القرآن $\frac{۲}{۳۷}$)

ترجمہ :" آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمے سیکھ لیے، پس اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوا۔ بیشک وہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا ہے"

شہنشاہِ حقیقی کی سلطنت میں جو اس کی رحمت سے مایوس ہو جائے وہ ابلیس کہلاتا ہے عزازیل نے سجدہ نہ کرکے جو گناہ کیا تھا، چاہیے تھا کہ توبہ کرکے اس کی تلافی کرتا، مگر وہ تو بالکل ہی رحمتِ باری سے مایوس ہو گیا۔ اس لیے ابلیس کہلایا۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں ابلیس کے معنی مایوس کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت دیکھئے کہ گناہ عظیم کے ارتکاب کے بعد بھی شیطان، ایک دُعا کرتا ہے اور قرآن گواہ ہے کہ وہ درخواست بھی رد نہیں کی جاتی۔ رحمتِ کاملہ اس مردود کو بھی "وقت معلوم" تک مہلت دے دیتی ہے۔ حالانکہ اس کے ارادے بھی نیک نہیں۔

اور یہ وقتِ معلوم بھی قیامت کی خبر لاتا ہے۔

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

ابنِ آدم خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو، اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ہماری کئی نفسیاتی اُلجھنیں ایسی ہیں کہ جو محض یاس اور قنوطیت کی پیداوار ہیں۔ اس سلسلے میں واعظ اور فقیہہ کے بھی کچھ فرائض ہیں اور اُسے ان سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونا چاہیے اس کی ذراسی بے احتیاطی گنہگار کو ہمیشہ کے لیے گمراہی کے گڑھے میں دھکیل سکتی ہے۔ گنہگار ہمارے رحم کا مستحق ہے نہ کہ نفرت کا۔

ہمیں گناہ سے نفرت ہونی چاہیے نہ کہ گنہگار سے۔

دوسروں کو ہدفِ ملامت بناتے وقت نہ جانے اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے۔ ہم گنہگاروں سے نفرت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے اعمال، ان جیسے ہوتے ہیں۔ ہم پاک بازوں کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ان کے سے کام نہیں کرتے۔

ہماری زندگی کا یہ تضاد کس قدر اندوہناک ہے!

ہمارے اسلاف بڑے رواداز تھے وہ اتنے بُردبار تھے کہ پہاڑ بھی ان کے صبر و تحمل کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ملامت کا غلط انداز خواہ کتنے خلوص اور دل سوزی پر مبنی کیوں نہ ہو کچھ مفید نہیں۔ کیوں کہ اس سے مجرم میں ضد اور کد بڑھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مناظرے اور عام مجادلے کبھی اشاعتِ دین کا باعث نہیں بن سکے۔ بلکہ اشاعتِ دین کا یہ میدان ہمیشہ فراخ حوصلہ، عالی ہمت بزرگوں کے ہاتھ رہا ہے کہ جو۔

گنہگاروں کو یاس کے سپرد نہیں کرتے تھے بلکہ بخشش کی اُمید دلاتے تھے۔

جن کے پاس ترغیب تھی۔ ترہیب نہیں۔

وعدہ تھا اور وعید نہیں۔

کیونکہ حکیم کا کام مریض کو شفا کا یقین دلانا ہے نہ کہ یہ کہنا یہ بیماری اپنی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے اور انجام کار ہلاکت ہے۔

کوئی معالج مریض کو مایوس کن حالت میں بھی شفا سے نا اُمید نہیں کرتا۔ جب جسمانی معالج رجائیت کا اس قدر مظہر ہے تو روحانی معالج کیوں نہ ہو گا۔

اس کائنات کے سب سے بڑے روحانی معالج کا بیان ہے۔

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا (حدیث بخاری)

سہولت پیدا کرو اور دشواری پیدا نہ کرو، بشارتیں دو، مانوس بناؤ مگر نفرت نہ دلاؤ اور دحشت نہ پھیلاؤ۔

دنیا کے عام قانون میں بھی ملزم رحم کا مستحق ہے، چنانچہ ایک فاضل مقنن کے پیارے الفاظ میں

"The accused is a favourite child of law."

قانون کی نگاہ میں ملزم پیارے بچے کی مانند ہے۔

لیکن رب العالمین کے قانون میں تو صرف ملزم ہی رحم کا مستحق نہیں بلکہ مجرم بھی اس کی رحمت سے محروم نہیں رہا۔

مولا کریم نے اپنے گنہگار بندوں کو اپنی نسبت سے یاد کیا ہے۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ ۔ لَا تَقْنَطُوْا
مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا

(القرآن $\frac{۳۹}{۵۳}$)

اے میرے گنہگار بندو! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ تحقیق اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔

انبیاء کرام کی سیرت رحمتِ خداوندی کی نشاندہی کرتی ہے۔

آج تک کسی پیغمبر نے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔

اور بھیجے ہوتے سے بھیجنے والے کے اخلاق کی آئینہ داری ہوا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو آخری پیغمبر رحمت للعالمین کی خاطر بہت عزیز ہے۔ لیکن انہیں بھی حکم دیا کہ اگر کافر اور مشرک آپ کو جھٹلائیں تو بھی انہیں میری رحمت سے مایوس نہ کرنا۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

فَاِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ (۶/۱۴۷)

اے میرے حبیب! اگر تجھے جھٹلائیں تو پھر بھی کہہ دے کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے۔

دعا میں رحمت واسعہ پر ایمان سے مقصد یہ ہے کہ دعا ہمیشہ اس یقین کے ساتھ مانگی جاتے کہ جس سے ہم مانگ رہے ہے، اس کے خزانۂ رحمت میں کسی چیز کی کمی نہیں اور وہ ہماری دُعا قبول کرنے پر قادر ہے۔

یقیناً جب پر امید انداز میں دعا کی جاتے گی تو وہ قبول بھی ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دُعا کے قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جبکہ عام خاطی انسان اپنے قول اور وعدے کا لحاظ رکھتے ہیں تو احکم الحاکمین جو قادر مطلق ہے اور صادق الوعد ہے۔ وُہ کیونکر اپنے وعدے کا پاس نہ کرے گا؟

پس جب خُدا سے اُمید رکھی جاتے گی تو یقیناً وہ محروم نہیں کرے گا۔

الكريمُ لا يُخَيِّبُ مَنْ اَطْمَعَهٗ

اگر دُعا فوری طور پر قبول ہوتی دکھائی نہ دے تو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدا پر یقین رکھتے ہوئے بہر طور دُعا مانگتے رہنا چاہیے۔ حدیث شریف ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا بندے کی دعا ضرور قبول کی جاتی ہے۔ جب تک وہ گناہ یا قطع رحمی کی دُعا نہیں مانگتا یا پھر جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! جلد بازی کیا ہے؟ فرمایا کہ دعا مانگنے والا یہ کہے کہ میں نے دعا مانگی اور میں نے دُعا مانگی یعنی بار بار دُعا مانگی لیکن قبول نہیں ہوتی اور پھر مایوس ہو کر بیٹھ جائے اور دُعا کو چھوڑ دے۔ (صحیح مسلم)

توجّہ اور حضورِ قلب

تجربہ شاہد ہے کہ بے توجہی سے جو کام کیا جائے وہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے دعا میں بھی توجہ اور شوق ضروری اور لابدی ہیں۔ ورنہ بقول مولانا الطاف حسین حالیؔ۔

؎ جی چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں

چنانچہ یقیناً وہی دُعائیں قبول ہوتی ہیں جو حضورِ قلب کے ساتھ مانگی جائیں۔

(In prayer the lips ne'er act the winning part without the sweet concurrence of the heart.)
HERRICK

رسُولِ پاکؐ نے فرمایا ہے کہ "خُدا سے دعا مانگو اس امر کا یقین کر کے کہ وہ ضرور قبول کرے گا اور اس بات کو جان لو کہ خُدا غافل دل اور کھیلنے والے کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔" (جامع ترمذی)

اگر عادت کے طور پر غیر شعوری حالت میں دُعا مانگی جاتے تو کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے اس امر کی تلقین کی ہے کہ دُعائیں ہمیشہ نئے اور تازہ الفاظ میں ہونی چاہئیں اگر ایک ہی قسم کے الفاظ ہمیشہ کے لیے مقرر کر لیے گئے تو حفظ کے باعث بلا ارادہ و نیت زبان پر جاری ہو جایا کریں گے اور ان میں دل کی حضوری میسر نہیں ہو گی

نئے الفاظ کا اہتمام یقیناً ارتکازِ توجہ کے لیے مفید ہے مگر یہ مقصود بالذات نہیں مناسب یہ ہے کہ مقررہ الفاظ کے ساتھ مقررہ دعائیں مانگی جائیں اور ان میں توجہ کا ویسے خیال رکھ لیا جاتے۔ کیونکہ ادعیہ ماثورہ الفاظ و مقاصد کا بہترین انتخاب ہے جو مستجاب الدعوات بزرگوں کی مساعی سے تکمیل کو پہنچا۔ نیز اس کے پس منظر میں استجابت کی تابناک مثالیں ہیں۔

قرآنی دُعائیں ایک لحاظ سے تاریخی دعائیں ہیں اگر وہ مانگی جائیں گی تو مانگتے ہی چشمِ تصور میں ماضی کے واقعات آجاتے ہیں اور جو قبولِ دعا کی نشاندہی کرتے ہیں۔

یہ دعائیں مُجرب المجرب ہیں اور یہی یقین، توجہ کے ارتکاز کا باعث بنتا ہے کہ یہ دعائیں سب سے پہلے ہمارے فلاں بزرگ نے مانگی تھیں اور وہ قبول ہوئیں اس کے بعد ہمارے پیش رو بزرگ بھی یہی دعائیں مانگتے رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتے رہے اسی طرح نبوی اور مسنون دعائیں جو احادیث کی شکل میں محفوظ ہیں وہ بھی اکسیر اثر ہیں۔

۳۔ احسان اور وسیلۂ حسنِ عمل

ہماری دعاؤں کا ایک بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی بخشش کا طلب کرنا ہے اور باقی مقاصد وہاں ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔

پس جب اللہ تعالیٰ سے مہربانی اور عفو کے امیدوار ہیں تو ہمیں خود بھی دوسروں کے ساتھ رحم و مروت کا سلوک کرنا چاہیے جب ہم کسی بھائی کی ذراسی لغزش معاف نہیں کرتے تو خدا سے ہم کس منہ سے بخشش کی طلب کر سکتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ دوسروں پر احسان کرنے اور ان کی غلطیوں کو معاف کر دینے کے بعد اسی عمل کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے اپنی بخشش کی دعا مانگیں۔

جو برتاؤ تم اوروں سے چاہتے ہو وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

کیوں کہ تورات اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔ (انجیل متی ۷/۱۲)

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللهُ لَكُمْ وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (القرآن ۲۴/۲۲)

تمہیں چاہیے کہ لوگوں سے درگزر کرو اور انہیں معاف کر دو۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے۔

انجیل مقدس نے تعلیم دی کہ

"جب تم دعا مانگو تو ریاکاروں کی مانند نہ بنو۔ کیوں کہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے کونوں پر کھڑے ہو کر دعا مانگنا پسند کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ انہیں دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔

بلکہ جب تو دعا مانگے تو اپنی کوٹھری میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے۔ دعا مانگ، اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا اور دُعا مانگتے وقت غیر قوم کے لوگوں کی

طرح بک بک نہ کرو۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بہت بولنے کے سبب ہماری سُنی جائے گی۔

پس ان کی مانند نہ ہو۔ کیونکہ باپ تمہارے مانگنے سے پہلے جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کے محتاج ہو۔ پس تم اس طرح دُعا مانگا کرو۔

اے ہمارے باپ! تو جو آسمانوں میں ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی پوری ہو ہماری روز کی روٹی، آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو بخشا ہے تو بھی اپنے قرض ہمیں بخش دے اور ہمیں آزمائش میں نہ پڑنے دے۔ بلکہ برائی سے بچا۔

اس لیے کہ تم اگر آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کرے گا اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کرے گا۔ (انجیل متی ٦ / ٥۔١٥)

اِنّ رحمۃ اللہ قریبٌ من المحسنین

اگر اس وقت نیکی نہ کی جاسکے تو دُعا مانگتے وقت پچھلی کسی نیکی کو یاد کر لینا چاہیے اور اسی کو وسیلہ بنا کر دُعا مانگنا چاہیے۔ یہ چیز میرے تجربے کے مطابق یقیناً دُعا کی قبولیت کی ضامن ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ نیکی بے ریا ہو، خلوص پر مبنی ہو اور محض رضائے الٰہی کے لیے کی گئی ہو۔ اگر کوئی ایسا نیکی کا عمل یاد نہ ہو تو پھر دُعا مانگتے وقت یہ کہنا چاہیے پالنے والے! میرے کسی ایسے عمل کے طفیل میری یہ دعا قبول فرمالے کہ جو تیرے نزدیک بے ریا اور مقبول ہو۔

حدیث شریف میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک بار تین مسافر کہیں جا رہے تھے راستے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ تینوں نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی۔ اتفاقاً بارش کے زور سے ایک چٹان اوپر سے گری اور غار کا منہ بند ہو گیا۔ بڑے پریشان ہوئے۔ بارگاہ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سوچا کہ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اپنے کسی نیک عمل کے واسطے سے خُدا کے حضور التجا کریں۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا۔ اے خداوند! میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے بچے چھوٹے سے تھے۔ میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ شام کو بکریاں لے کر گھر آتا تو

دودھ دھو کر پہلے اپنے والدین کو پلاتا پھر اپنے بچوں کو دیتا۔ ایک روز واپس اپنے گھر دیر سے آیا۔ والدین سو چکے تھے۔ جگانا مناسب نہ سمجھا۔ دودھ لے کر سرہانے کھڑا رہا۔ اسی حالت میں ساری رات گذار دی۔ صبح اٹھے تو انہیں دودھ پلایا پھر اپنے بچوں کو پلایا۔ پالنے والے! یہ کام میں نے محض تیری رضا کے لیے کیا تھا اس لیے تو اس پتھر کو دور ہٹا دے۔ یہ کہنا تھا کہ پتھر کچھ ایک طرف کو ہٹ گیا۔ اس کے بعد دوسرے دو مسافروں نے اپنے اپنے پرخلوص عمل بتا کر دعائیں مانگیں اور پورا پتھر ایک طرف ہٹ گیا اور وہ لوگ بحفاظت باہر آگئے۔ (صحیح بخاری)

---

۴ - تضرع

اللہ تعالیٰ نے تضرّع (گڑگڑا کر) دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔ تضرّع میں خوف اور طمع کے جذبات اپنی پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر یہ خوف اپنے گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی عدالت کے احساس کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی طرح طمع کی وجہ سے انسان رحمتِ الٰہی کا زیادہ سے زیادہ مشتاق اور امیدوار ہوتا ہے۔ طمع ایک برُا وصف ہے۔ مگر تعدیل سے یہ برائی اچھائی میں تبدیل ہوگئی ہے۔

درحقیقت دنیا کی کوئی چیز طبعاً بُری نہیں۔ اس کا محل استعمال اسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ تضرّع بں انتہادرجے کا عجز ہوتا ہے، جس سے رحمتِ خداوندی از خود ترس کھانے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا۔

"لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، اس کی پوری صفت و ثنا بیان کرتے رہنے کی، طمع اور خوف سے دعائیں مانگنے کی اور دعاؤں میں خشوع و خضوع کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کے گھرانے کی یہی صفت بیان کی ہے۔

حضرت اُمِّ درداءؓ بھی فرماتی ہیں کہ جب دل خوفِ خدا سے حرکت کرنے لگتے ہیں ایسے وقت انسان کو خدا سے دعا مانگنا چاہیے۔ (تفسیر ابن کثیر)

۵- اکلِ حلال

(Who so will pray, he must fast and be clean,
And fat his soul, and make his body lean)
CHAUCER

حدیثِ رسول ؐ سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جب تک انسان کا کھانا پینا پاک اور حلال نہ ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانے میں دعا کے قبول نہ ہونے کا ایک سبب اُکل حرام بھی ہے۔

افسوس ہمارے نزدیک حلال و حرام کا تصور جانوروں کے گوشت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم کوّے اور چیل کے گوشت کو اس لیے نہیں کھاتے کہ یہ حرام ہے، اور خنزیر کا تو نام سُن کر تھوکنے لگتے ہیں۔

مگر رشوت کو ہم شیرِ مادر سمجھ کر ہضم کر لیتے ہیں۔ غیبت کو قرآن پاک نے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے اور ہماری کوئی محفل غیبت کے بغیر نہیں جمتی۔

حرام کھا کر ربنا (اے ہمارے پالنے والے) کہنا اللہ کے حضور میں گستاخی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمارے اسلاف، اکلِ حلال کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ بزرگ مستجاب الدعوات بھی تھے، حلال کھانے سے روح میں بالیدگی پیدا اور کیف و جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جبکہ حرام کھانے سے روح میں کثافت پیدا ہو جاتی ہے اور دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ رسول پاک ؐ نے ایک بار مستجاب الدعوات حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ سے فرمایا تھا۔ اے سعد! اپنے رزق کو پاک رکھ۔ تیری دُعا ہمیشہ قبول ہوگی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جس آدمی کے پیٹ میں ایک نوالہ بھی حرام کا ہوگا۔ اس کی چالیس روز تک دُعا قبول نہ ہو سکے گی۔

ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ؐ ہے۔

ثم ذکر الرجلَ یُطیلُ السفرَ اشعث اغبر یَمُدُّ یدیہ الی السّماءِ یاربِّ یاربِّ و مطعمہ، حرامٌ ومشربُہٗ حرامٌ وملبَسُہٗ حرامٌ وغُذِی بالحرامِ فَاَنّٰی یُستجابُ لِذالکَ (صحیح مسلم)

ترجمہ :۔ پھر آپؐ نے ایسے شخص کا تذکرہ فرمایا کہ جو لمبا سفر طے کرتا ہے۔ اس کے بال پراگندہ اور چہرہ غبار آلودہ ہے وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا پھیلا کر اے میرے پالنے والے کہہ کر بار بار دعا مانگتا ہے لیکن اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ حرام کا لباس پہنے ہوتے ہے اور حرام غذا پر اس کی پرورش ہوئی ہے پھر کیسے اور کیونکر اس کی دعا قبول ہو؟

۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسلام میں چونکہ دین و دنیا کی تفریق نہیں لہذا ہر مسلمان پر نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے لوگوں کو باز رکھنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

امتِ محمدیہ پر ہی تمام امتوں کی قیادت ہے

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

اسلام کے نظریہ کے مطابق تارک الدنیا سے زیادہ ایک مصلح کی دعا میں اثر ہوتا ہے کہ جس کی زندگی جدو جہد کی زندگی ہوتی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ (دو باتوں میں سے ایک ضرور ہو گی یعنی یا تو) تم البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے (اور یا) عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرمائے گا۔

اور اس وقت تم خدا سے دعا مانگو گے اور تمہاری دعا قبول نہ کی جائے گی۔

(ترمذی)

موجودہ دور میں ہماری دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے کی ایک وجہ ہمارا اس فریضے سے تغافل ہے۔ واقعی اس فریضے سے عہدہ برا ہونا الوالعزمان ہمت کا کام ہے۔

آج کل ایک نیک اور شریف آدمی کو برا کہہ دینا آسان ہے۔ مگر برے کو برا کہنا بڑا مشکل ہے۔

کن لوگوں کی دُعا قبول ہوتی ہے؟

- مظلوم کی یہاں تک کہ وہ ظالم سے بدلہ نہ لے لے۔
- مجاہد کی کہ ابھی وہ جہاد میں مصروف ہو۔
- حاجی کی کہ جب تک کہ وہ گھر واپس نہ آجائے۔
- بیمار کی کہ ہنوز مبتلائے آلام ہو۔
- مسافر کی کہ ابھی اس کے بال غبار آلود ہوں۔
- روزہ دار کی جب کہ وہ روزہ افطار کرے۔
- عادل حاکم کی بالخصوص جب کہ وہ عدل کرے۔
- عفو کرنے والے کی جبکہ وہ دوسروں کی لغزش معاف کرے۔
- باپ کی جبکہ وہ خوش ہو کر بچّوں کے حق میں دُعا کرے۔
- غائب کی غائب کے لیے، کیونکہ اس میں خلوص ہوگا۔
- تلك عشرة كاملة

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ مدفوعٍ بالابواب لَوْ حَلَفَ باللّٰهِ لَابَرَّهٗ

بہت سے پریشان حال، پراگندہ بال لوگ ہیں کہ جنہیں دروازوں سے دھتکار دیا جاتا ہے۔

اگر وہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ اسے ضرور پوری کر دیتا ہے۔

مقبول اوقاتِ دُعا

- اذان کا وقت (ابو داؤد۔ دارمی)
- اذان اور تکبیر کے درمیان (ابو داؤد۔ ترمذی)
- بروز جمعہ منبر پر امام کے بیٹھنے سے نماز کے آخر تک (مسلم)
- بروز جمعہ عصر کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک (ترمذی)
- جہاد کے وقت جبکہ گھمسان کا رن پڑ رہا ہو۔ (ابو داؤد۔ دارمی)
- پچھلی رات کے اثنا میں (ترمذی)
- فرض نماز کے بعد (ترمذی)
- سجدے کی حالت میں (ترمذی) (مشکوٰۃ)
- شب قدر کی رات کہ جو رمضان کے عشرہ آخر میں ہے۔

کون سے امور مانعِ اِستجابت ہیں ؟

- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت
- غفلت اور بے توجہی (ترمذی)
- عجلتِ قبول کی خواہش (مسلم)
- حرام کھانا پینا اور پہننا (بخاری)
- قبولیتِ دعا پر یقین کا نہ ہونا (بخاری)
- ظلم اور زیادتی
- جادو گری
- قطع رحمی
- گناہ کی طلب

مسنون طریقۂ دُعا

دونوں ہاتھ اُٹھا کر اور ہتھیلیوں کو منہ کی جانب کر کے دعا مانگنا چاہیے اور جب دُعا سے فارغ ہو جائیں تو ہاتھ منہ پر مل لینے چاہئیں۔

بقول ابن عباسؓ ہاتھ کندھوں کے برابر اُٹھانے چاہئیں۔

حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا ہے کہ ہاتھوں کو زیادہ اُونچا اٹھانا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صرف سینے تک ہاتھ اُٹھاتے تھے۔

دُعا مانگنے سے پہلے درود شریف اور بعد میں آمین پڑھ لینا چاہیے۔ آمین کا لفظ دیگر الہامی مذاہب میں بھی اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ کریمٌ یستحی اِذَا رفع الرجلُ الیه یدیه اَن یردهما صفرا خائبتین۔ (جامع ترمذی)

ترجمہ: حضور صلعم نے فرمایا اللہ تعالیٰ بہت حیادار ہے۔ بغیر مانگے دینے والا ہے اور حیا کرتا ہے آدمی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے تو وہ انہیں خالی پھیر دے۔

کلماتِ ندا

اَللّٰھُمَّ (اے اللہ)

رَبَّنَا (اے ہمارے پالنے والے)

قرآنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرنے اور ندا کے لیے کلماتِ ندا میں ایک تو معبود حقیقی کا ذاتی نام اللہ استعمال ہوا ہے اور دوسرا صفاتی نام جو کہ ربّ ہے۔

دُعاؤں میں ان دو اسماءِ مبارکہ کا اختصاص خالی از حکمت نہیں۔

بمصداق

فِعلُ الحکیمِ لا یخلو عن الحِکمۃ

دانا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا

اَللّٰھُمَّ

لفظ اللہ - اسم ذات ہے۔ اس کی نہ جمع ہے اور نہ تانیث۔

چونکہ جمع اور تانیث، توحید کے منافی تھے لہذا اس اسم پاک کو ان سے پاک رکھا گیا۔ دورِ جاہلیہ میں جبکہ شرک، عرب معاشرہ کی نس نس میں رچ چکا تھا اور تمدن ثقافت اور زبان پر اس کی منحوس پرچھائیں پڑنے لگی تھیں تو یہ لفظ اس وقت بھی محفوظ رہا کسی عرب کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس کا غلط استعمال کرے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کسی بُت کا کبھی یہ نام نہیں رہا۔

بعض علماء نے اس کا مادہ (Root) ا ل ہ قرار دیا ہے ان کے خیال کے مطابق اَلٰہ (معبود) میں ال کے اضافے سے اس میں تعریف پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس تعریف کے بعد یہ لفظ فقط اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہو گیا۔ ا ل ہ کا مادہ تمام تر سامی زبانوں میں "خدا" کا مفہوم ادا کرتا رہا ہے۔ اللہ کا لفظ سراپا جمال و کمال ہے، اس میں کوئی نقطہ تک نہیں کہ جو کسی نکتہ چیں کی انگشت نمائی کا باعث بن سکے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ

اہلِ عرفان کے لیے اس لفظ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کا ہر حرف اپنی جگہ معبودِ حقیقی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً اللہ سے الف کو الگ کر دیا جائے تو لِلّٰہ، ل کو ہٹا دینے سے لَہٗ اور پھر ل کا پردہ ہٹ جانے کے بعد ہٗ (ہو) رہ جاتا ہے۔ اس میں کوئی جز ایسا نہیں جو اس واجب الوجود خدا کے لیے مستعمل نہ ہو۔

ع وكُلٌّ إلىٰ ذاكَ الجمالِ يُشيرُ!

بعض محققین نے اللہ کو اِلٰہ سے مشتق قرار دیا ہے اور اِلہ سے مراد تحیّر اور درماندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ طائرِ عقل کی بلند پروازیاں، کنہ ذات کا ادراک نہیں کر سکتیں؛ عرفان اور معرفت کی پہنائیوں میں جس قدر ہم بڑھیں گے، حیرت اتنا ہی بڑھتی چلی جائے گی۔ بہرحال یہ تحیّر بھی علم ہے، جہالت نہیں، حق ہے، باطل نہیں۔

مگر وجدانِ قلب کے ذریعہ جو عرفانِ حق میسر آئے، اس میں تحیّر نہیں طمانیت ہے۔

اور سرور سرمدی ہے کہ جکی لذت، قال کی نہیں حال کی محتاج ہے۔

دانائے راز اقبالؒ نے اس کو عشق سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ان دو طریقہائے عرفان کی وضاحت فرماتے ہوتے کہتے ہیں۔

اک دانشِ نورانی، اک دانشِ بُرہانی

ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

مختصر یہ کہ یہ اسم ذات تمام اسمائے صفات کا جامع ہے۔ اللہ کا نام آتے ہی تمام صفات اور صفاتی نام خود بخود چشم تصوّر میں پھرنے لگ جاتے ہیں۔ بالخصوص رحمان اور رحیم کی صفات تو اس کے جلو میں آتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا نام قرآن میں سب سے زیادہ وارد ہوا ہے ایک اندازے کے مطابق یہ لفظ ۲۷۹۹ بار دُھرایا گیا ہے اور یہ امر اس کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔

دُعا میں اَللّٰھُمَّ (اے اللہ) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

دَورِ جاہلیہ میں غالباً اللہ کے نام کے ساتھ جلال اور ہیبت کے تصورات وابستہ تھے۔ لہٰذا صلح حدیبیہ کے موقع پر کفار نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی بجائے معاہدے کے سرنامے پر باسمکَ اللّٰھُمَّ لکھنے پر اصرار کیا ہے۔

جب کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اللہ کے ساتھ رحم اور جمال کی صفات آتی تھیں۔

رَبَّنَا

بچے کو بھوک لگتی ہے تو ماں کو پکارتا ہے۔ پیاس لگے تو ماں کو بلاتا ہے۔ دُکھ ہو درد ہو، ہر حال میں رو کر اپنی ماں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔

غرضیکہ بچہ دُکھ درد میں اپنے والدین کا محتاج ہے، وہی اس کے پرورش کرنے والے ہیں۔ والدین کی یہ پرورش نظامِ ربوبیت کی ابتدائی سٹیج ہے۔ رب العالمین نے ہی والدین کی طبع میں جبلی طور پر یہ وظیفہ رکھ دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کریں۔

اس معمولی سی پرورش کے اعزاز کا بدلہ (Credit) بھی والدین کو دے دیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ والدین خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں، بیٹے پر ان کی خدمت فرض ہے۔ بیٹا، والدین کے سامنے اُف تک نہیں کر سکتا۔

دینِ فطرت درحقیقت اس عمل سے انسان کے ذہن میں عظیم الربوبیت خُدا کی عظمت اور احسان کے نقوش کو پختہ اور اس کے حق ربوبیت کو واضح کرنا چاہتا ہے۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اسے گرد و پیش کے حالات کے مطالعہ کا موقعہ ملتا ہے۔

حدِ نگاہ سے دُور۔ بہت دُور تک بچھی ہوئی زمین کا فرش۔ اُوپر آسمان کی نیلگوں چھت، ازل سے ابد تک کے لیے روشنی کا مفت انتظام۔ پینے کے لیے پانی کا وسیع اہتمام، کھانے پینے کے لیے اسبابِ معاش موجود اور وسائل قُدرت متعدد و محدود ایک ایک ذرہ اپنے دامن میں توانائی کی دُنیا لیے ہوئے ہے۔

پانی جس کے بغیر زندگی امرِ محال ہے۔ اگر اس کے اجزائے ترکیبی میں قدرت ذرا سی تبدیلی کر دے تو حیواتی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر رہ جائے گی۔ وہ ہوا کہ جس میں ہم سانس لیتے ہیں، اس میں عناصر کا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو روئے زمین پر کوئی متنفس نظر نہ آئے۔

دیکھئے قادرِ مطلق کا نظامِ ربوبیت کس قدر عظیم اور ہمہ گیر ہے۔ ہر شے اپنا رزق حاصل کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ پتھروں میں رہنے والے کیڑے بھی۔ نیک و بد، اطاعت گذار اور گنہگار سب اس کے خوانِ کرم سے مزے اڑا رہے ہیں۔

اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِی لمریخلْ مِنْ فَضْلِہٖ المقیمون علیٰ
مَعْصِیَتِہٖ وَلَمْ یُجَازِہٖ لِاَصْغرِ نعمہٖ المُجْتَھِدُوْن فی،
طَاعتِہٖ اَلغَنِیُّ الَّذِی لَا یُضِنُّ برزقہٖ علیٰ جَاحِدِہٖ ۔

(حضرت علی کرم)

ہر قسم کی تعریف اس ذات کے لیے ہے کہ جس کے کرم سے گنہگار بھی محروم نہیں اور انتہائی کوشش کرنے والا بھی اس کی نعمت کا شمہ تک کی مکافات نہیں کر سکتے۔ وہ بے نیاز ذات! کہ اپنے نافرمان پر بھی بخل روا نہیں رکھتی۔

قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ نے صرف اہلِ ایمان کے لیے رزق کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اس حصر کو روا نہیں رکھا۔ بلکہ فرمایا۔

وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیْلاً (۱۲۶/۲)

اور جو کفر کرے گا، دنیا کی حیات چند روزہ کا سامان تو اسے بھی دونگا۔

صحیفۂ فطرت (Work of God) پر تدبر اور تفکر کر کے ہم نہ صرف اپنے جذبۂ تلاشِ موجد کی تسکین کرتے ہیں بلکہ یہ امر ہماری رہنمائی اس ذات کی صفتِ ربوبیتِ مُطلقہ کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔

ہمارا رب صرف انسانوں کا رب نہیں، بلکہ کئی جہانوں کا پالنے والا ہے اور۔ وہ جہاں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

لفظ رب العالمین، دین اسلام کے تصوّرِ ربوبیّت کی شانِ جامعیت، وسعت اور ہمہ گیری کی نشاندہی کرتا ہے۔

اَب (باپ) عیسوی دَور کا تصور ہے اور اس کی محدودیت ظاہر ہے۔ جب دین کی تکمیل ہو گئی تو اس تصوّر میں بھی وسعت اور آفاقیت آگئی اور رب نے اَب کی جگہ لے لی۔

رب کا لفظ تمام سامی زبانوں میں موجود ہے اور اس کے معنی پرورش کے ہیں۔ عربی جو کہ اللہ کے "کلامِ آخرین" کی متحمل ہوئی۔ اس میں اس کے معنی صرف معمولی پرورش کے نہیں بلکہ اس سے مراد بقول علامہ راغب اصفہانی۔

مکمل نشوو ارتقا اور حدِ تمام تک پرورش ہے۔

مذاہب نے اپنے تصورِ الٰہ میں شفقتِ پدری اور ماں کی ممتا کا انتہائی جذبہ شامل کر رکھا ہے۔ صحفِ قدیم میں تو یہ تاثر عام ہے۔ بالخصوص عہد نامہ جدید یعنی اناجیل اربعہ میں۔ آخری پیغمبر حضرت محمدؐ نے بھی الخَلقُ عیالُ اللّٰہ کہا ہے ——— اس شفقت کو انجیل نے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔

بتاؤ تو سہی کہ تم میں سے کون ایسا آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اس کو پتھر دے یا مچھلی مانگے تو سانپ دے۔

پس جب تم بڑے ہو کر اپنی اولاد کو اچھی چیزیں دیتے ہو تو تمہارا آسمانی باپ تو اپنے مانگنے والوں کو ضرور اچھی چیزیں ہی دے گا۔

تفسیر ابن کثیر میں ایک حدیث شریف ہے کہ عہدِ رسالت مآب میں، کسی جنگ کے اندر کچھ لوگ قیدی بنائے گئے ان میں ایک بچے والی عورت بھی تھی۔ بچہ گم ہو گیا تو وہ پاگلوں کی طرح اُسے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ جب مل گیا تو، اسے سینے سے لگا کر بار بار دودھ پلاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ منظر دیکھ کر اپنے صحابہؓ سے فرمایا۔

"بھلا بتاؤ، کیا یہ عورت اپنے اختیار کے باوجود اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟"۔

صحابہ کرام نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں یا رسول اللہ!"

اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بھی زیادہ مہربان ہے"۔

ماں باپ کو اپنے بچے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ وہ والدین کی آنکھوں کے تارے ہوتے ہیں خواہ وہ بدشکل ہی کیوں نہ ہوں۔ ماں کی نظر میں بچے کا حسن ہی حسن ہے۔ بچے نافرمانیاں بھی کرتے ہیں اور والدین چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ بچے جس طرح والدین کی نظر میں حسین ہوتے ہیں اسی طرح معصوم بھی۔ خواہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی

کیوں نہ جرم کریں ۔ والدین التباس نظر کے تو مقر ہو سکتے ہیں مگر اپنے بچوں کو مجرم نہیں ٹھہرا سکتے ۔

اس سے کہیں بلند سطح پر

ہمارے پالنے والا ، ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے ۔ وہ ستّار العیوب ہے اس عظیم الربوبیت رحمٰن کا یہ فیضانِ عام ہے کہ نیک و بد اس کے خوانِ نعمت سے لُطف اُٹھاتے ہیں ۔ بڑے سے بڑا نافرمان بھی محروم نہیں ۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام نے ہمیں صفتِ ربوبیت کو وسیلہ بنا کر دُعا مانگنے کی تلقین کی ہے ۔

قرآن پاک میں جس قدر دعائیں وارد ہوئی ہیں وہ اکثر و بیشتر رَبِّ و رَبَّنا کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں ۔

رَبَّنا کہہ کر ایک طرف ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نعمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وُہ ہمارا پرورش کرنے والا ہے ۔

اور ساتھ ہی اسے اپنا آقا اور مالک مان کر اس کی قدرت کا بھی اقرار کرتے ہیں ۔

باب چہارم

قرآنی دُعاؤں کے خصائص

قرآنی دعائیں اپنی جامعیت اور متنوّع خوبیوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں اور حقیقت میں اسلام کے ہاں جو دُعا کا تصور ہے، اس کا جوہر بھی یہاں آکر کھلتا ہے ان دعاؤں کے مندرجہ ذیل خصائص قابلِ ذکر ہیں۔

- نمونۂ دعا
- مقاصد کا تعین
- دعوتِ عمل
- تاریخِ قدیم کے نمایاں خط و خال
- عہدِ رسالت مآب کا نفسیاتی جائزہ
- حکمتِ عملی
- پیش گوئی
- سلفِ صالحین کی سیرت
- مسائل و معارف
- اسمائے صفاتِ الٰہی

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

نمونۂ دُعا

اگر کوئی حاکم کسی سائل کو خود مضمونِ درخواست سمجھادے تو درخواست کا منظور ہوجانا یقینی ہے۔

پس احکم الحاکمین کی یہ کس قدر کرم نوازی ہے کہ اس نے اپنی آخری اور ناقابلِ تحریف کتاب میں مختلف درخواستوں کی عبارتیں تک بیان فرمادی ہیں۔ یہ درخواستیں اصطلاحِ دین میں دُعا کہلاتی ہیں۔

قرآن پاک میں نیک بندوں کی جو دعائیں بیان ہوئی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہیں۔ اور ہمارے لیے ان کا مانگنا سعادت مندی کا باعث ہے۔

مزید رہنمائی کے لیے غیر مستحسن دعاؤں کا نمونہ بھی دے دیا گیا ہے۔ مستحسن اور غیر مستحسن دعاؤں کے یہ نمونے ایک طرف اگر نفسِ دعا کے خط و خال کو واضح کرتے ہیں تو دوسری طرف قرآن مجید کی جامعیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ دوسری آسمانی کتابوں میں اس قدر اہتمام اور آسانی نہیں پائی جاتی

یہ دعائیں مختصر اور جامع ہیں۔

چونکہ یہ قرآن پاک کا حصہ ہیں۔ اس لیے اس میں اعجازی شان بھی نمایاں ہے۔ بلاشبہ ان سے بہتر الفاظ و مطالب کا انتخاب ممکن ہی نہیں۔

مقاصد کا تعیّن

قرآن پاک نے دُعا کے سب پہلوؤں پر سیر حاصل واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ اور کوئی پہلو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

چنانچہ اس مقدس کتاب میں مختلف دعاؤں کا تذکرہ موجود ہے۔ جس سے مقاصد کا تعین آسانی سے کیا جاسکتا ہے اور جو مقاصد ان دعاؤں میں ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستحسن ہیں، ہمیں انہی کی طلب میں رہنا چاہیے اور یہ اس لائق ہیں کہ ان کے لیے دُعا کی جائے۔

یہ مقاصد نہایت اعلیٰ وارفع ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اسلام کا سارا نظام حیات انہی پر مبنی ہے۔ چنانچہ انہی دعاؤں میں دین و دنیا کی تفریق کا شائبہ تک بھی نہیں۔ یقیناً مذہب اور سیاست کا تال میل ہی دین کی جامعیت اور زندگی کی ہمہ گیر رہنمائی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اس لحاظ سے قرآنی دعاؤں کی فضیلت رُوزِ روشن کی طرح ہے اور اس میں کسی کو مجالِ کلام نہیں۔

قرآنی دُعاؤں کے اہم مقاصد یہ ہیں:-

- صراطِ مستقیم کی ہدایت
- رُشد و ہدایت
- شرحِ صدر
- تسہیلِ امر
- تاثیرِ زبان
- اعلائے کلمۃ الحق
- نصرتِ ربانی
- رحمتِ ایزدی
- صبر و استقامت
- تسلیم و رضا
- ظلماتِ غم سے نجات
- دشمنوں سے حفاظت
- تخریب سے نجات
- بخشش و مغفرت
- شہادتِ حق
- للّٰہیت
- اخوت
- تکمیلِ ایمان
- صالحین کی رفاقت
- امامت اہل تقویٰ
- ازواجِ طیبہ
- اولاد صالحہ
- مغفرت والدین
- توفیق عملِ خیر
- قبولیتِ اعمال

اور اجمالاً یہ کہ دُنیا و آخرت کی بھلائی!
چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام علیہ و آلہ والسلام نے قرآنی دُعا

- رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَّفِی الاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عذابَ النَّارِ

پڑھنے کی پُر زور تلقین کی ہے۔

دعوتِ عمل

یہ کائنات بڑی متنوع ہے اور یہاں کی ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ایک پہلو پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا پہلو بالکل نظروں سے گر جاتا ہے۔

یہ طریقِ کار کسی طرح درست نہیں اس سے نہ صرف غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ تعصّب کو بھی جڑ پکڑنے کا موقع ملتا ہے۔

سوٗ اتفاق اس افراط و تفریط کی زد سے عمل اور دُعا بھی محفوظ نہیں رہے۔ چنانچہ بعض مذاہب نے دعا کو اس قدر غیر معمولی اہمیت دی اور اس کی آفادیت میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ لوگوں نے عمل سے یکسر ہاتھ اُٹھا لیے۔

ہمارے ہاں تو ستم ظریفی یہ ہوئی کہ عمل سے مراد ہی اوراد و وظائف رہ گئے۔ ہر وہ شخص کہ جو بیکارِ محض ہو اور وظیفوں پر اس کا مدارِ حیات ہو، عامل قرار پایا۔ بلکہ طرفہ تماشا یہ کہ عمل ہمارے نزدیک بھنگ اور چرس پینے کا نام ہے۔

واقعی جب کسی قوم پر زوال اور ادبار مسلّط ہوں، اس کا تمدن اس کی ثقافت اور اس کی زبان کچھ بھی محفوظ نہیں رہتے۔ الفاظ کے ساتھ بھی اس طرح کی زیادتیاں روا رکھی جاتی ہیں۔

دوسری طرف بعض لوگوں نے عمل کی فضیلت میں اس قدر زورِ بیان صرف کیا کہ دُعا بے کارِ محض نظر آنے لگی۔

اُدھر افراط تھی اور ادھر تفریط۔ لیکن حق ان کے بین بین ہے۔ اسلام جو ایک لحاظ سے نظامِ اعتدال ہے۔ اس نے عمل اور دُعا کی صحیح حیثیت واضح اور متعین کر دی ہے۔

قرآن پاک میں جس قدر دعائیں وارد ہوئیں ہیں، وہ از خود ترغیب عمل دیتی ہیں۔ ان کے جملے کیف آور، رُوح پرور اور ایمان افروز ہیں۔ یہ دعائیں سازِ عبودیت کے تاروں کو چھیڑتی ہیں اور انسان میں نیک کاموں کی لگن پیدا کرتی ہیں۔ نیک خواہشات

اور نیک ارادے، انسان کی سیرت کو نیک بناتے ہیں اور دعاؤں کا دامن ان سے بھرا ہوا ہے۔

ایک قرآنی دُعا میں متقین کی امامت کی آرزو کا اظہار ہوا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی دُعا مانگنے والا پہلے اپنی زندگی میں اتقا اور پرہیزگاری کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ جب کوئی مسلمان ہنوز متقی ہی نہ ہو وہ متقین کی جماعت کی امامت (Leadership) کی طلب کیسے کر سکتا ہے۔ کیونکہ اہلیت اور طلب (First deserve, then desire.) کا اصول اس کے پیش نظر ہوگا۔

قرآن بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اس وقت دعا مانگتے ہیں جب وہ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا چکے ہوتے ہیں۔ لفظ تقبل منّا (ہماری یہ خدمت قبول فرما) بلاشبہ عمل کی یاد دہانی کراتا ہے۔

حضرت نوحؑ نے نصرت ربانی کی طلب کی ہے تو ساتھ ہی جدوجہد بھی فرمائی ہے اور جب طوفان سے اپنی اور اہل ایمان کی نجات کی دُعا مانگی ہے تو بحکم خدا کشتی بھی تیار کر لی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونۂ عمل ہے۔ ان بزرگوں نے مناسک حج معلوم کرنے کی خواہش کی ہے تو پہلے تلاش حق میں صحرانوردی کی کٹھن منزلوں سے گزر چکے تھے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ایثارِ عمل سے ارکان مناسک ہی خود قائم کیے ہیں۔

مثلاً سعی بین الصفا والمروہ، حضرت ہاجرہ کی اس اضطرابی دوڑ دھوپ کی یادگار ہے کہ جو اس نے اپنے بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں کی تھی اور جانوروں کی قربانی، اس عظیم قربانی کی نشانی ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ نے ذبحِ اسماعیل کی صورت میں پیش کی تھی۔ اور جس کا ایک مقصد انسانی قربانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تھا۔

امام الموحدین نے ایک بار بت پرستی سے محفوظ رہنے کی دُعا مانگی ہے تو ساری زندگی بُت پرستی کے خلاف جہاد کرنے میں گزار دی ہے۔

لڑائی میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے لیے دو شرائط کا اعلان کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو القرآن ۸/۴۵)

۱۔ ثابت قدمی۔
۲۔ بکثرتِ ذکراللہ
یہاں یاداللہ سے مراد مفسرین کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا اور دعائیں مانگنا ہے۔

اصحابِ طالوتؑ نے جب اللہ تعالیٰ سے کافروں کے خلاف نصرت چاہی ہے تو پہلے میدانِ جنگ میں نکلے ہیں اور پھر ثابت قدمی کی دُعا مانگی ہے۔

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صبراً وَّ ثَبِّتْ اقدامَنَا وَانصُرْنا
على القوم الكافرين

اس دُعا کا لفظ لفظ عمل کی دعوت دے رہا ہے۔

اسی طرح اصحابِ کہف بھی مانگتے ہیں تو اس وقت کہ جب حق کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے ہیں، صرف دُعاؤں کے سہارے ایمان محفوظ رہ سکتا تو وہ کبھی گھر سے نہ نکلتے۔

سچائی کے ساتھ دخول اور سچائی کے ساتھ خروج کی دُعا کہ جو زبان رسالت سے ادا ہوئی، ایک متحرک رواں دواں زندگی اور عمل پیہم کی نشاندہی کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ دعائیں عمل اور برابر عمل کی تلقین کرتی ہیں اور بلاشبہ کارزارِ حیات کے مجاہدوں کے لیے رجز کا کام دیتی ہیں۔

تاریخِ قدیم کے نمایاں خط و خال

قرآن مجید میں جو دعائیں وارد ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق عہد قدیم کی مشہور شخصیتوں سے ہے اور شخصیتیں بالعموم انبیاء کرام کی ذواتِ مقدسہ ہیں اور درحقیقت عہد قدیم کی جو کچھ تاریخ محفوظ رہ گئی ہے۔ وہ انہی نفوس قدسیہ کی مرہونِ منت ہے۔ ہر شخصیت کے کارناموں کا ہیولا ہمیشہ آرزو سے اُٹھتا ہے، گویا کارنامے ابتدا آرزو کی شکل میں ہوتے ہیں۔ جب کہ آرزو کے خدا تعالیٰ کے سامنے اظہار کا نام دُعا ہے۔ اس لحاظ سے دعائیں اپنے مانگنے والوں کے کارناموں اور عہد پر کافی روشنی ڈال سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کو اپنے اپنے عہد میں جو مسائل درپیش تھے، ان کا تاثر ان کی دعاؤں سے بخوبی مترشح ہے۔

حضرتِ آدمؑ کی دُعا واضح الفاظ میں ان کے اس ترک اولیٰ کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو ان کے ہبوط کا باعث بنا تھا۔ حضرت آدمؑ کی زندگی کا یہی اہم واقعہ ہے اور اسے ہم دُعا کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح حضرت نوحؑ کی پوری زندگی کی تصویر ان کی دعاؤں کے آئینے میں جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہی دَورِ مغلوبیت کا تاثر بددعا، طوفان اور کشتی نجات

ابراہیم خلیلؑ کے عہد کے مشہور واقعات، تعمیرِ حرم، منصب امامت اور ملّتِ حنیف کا قیام ہیں اور اُن کی دعاؤں کو سامنے رکھ کر یہی نتائج بآسانی نکالے جاسکتے ہیں۔

حضرت لوطؑ کے عہد کا اہم اخلاقی اور معاشرتی قضیہ، فعل قبیح کی گرم بازاری تھی اللہ کے اس پیغمبر نے اس بے راہ روی کے خلاف پُرزور جہاد کیا۔

چنانچہ ان کی دُعاؤں میں بھی اس کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔

دعاؤں میں عورتوں کے مکر و فریب، قید و زندان اور تاویل احادیث کا جب ذکر آئے گا تو یقیناً حضرت یوسفؑ کی حیاتِ طیبہ کے نقوش اُبھر آئیں گے۔

موسوی عہد کے اہم واقعات، قبطی کی موت ہجرت مدین، حضرت شعیبؑ سے ملاقات فرعون کی طرف بعثت، ہارون کی معیت، ساحروں سے مقابلہ اور ان کی شکست واقعۂ طور

سحر سامری اور گوسالہ پرستی ہے جو ایک ایک کر کے حضرت موسیٰؑ کی دعاؤں میں بیان ہوئے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کی شہرت، ایک بڑے جاہ و جلال والے بادشاہ کی حیثیت سے ہے اور آپ کی عظمتِ اقتدار، آپ کی ایک دُعا سے ظاہر ہے۔

رَبِّ اغفرلی وَھب لی ملکا لا ینبغی لِاَحَدٍ مِّنْ بعدی

حضرت ایوبؑ کی زندگی کی ابتلا بیماری اور مصیبت کی صورت میں ظاہر ہوتی ان کی دعا سے بھی یہی گوشہ نظروں کے سامنے آتا ہے۔

اصحابِ طالوت کی زندگی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ ان کی دُعا کی بھی یہی آرزو ہے۔

حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں ایک زندہ جاوید لڑکے سے نوازا گیا کہ نہ صرف خود دُعا اور خوشخبری کا نتیجہ تھا بلکہ کتنی خوشخبریوں کا باعث بھی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے سوانح نامکمل ٹھہریں گے جب تک ان میں آسمانی خوانِ نعمت کا تذکرہ نہ ہو چنانچہ ان کی دعا میں اس امر کا تذکرہ موجود ہے۔

مزید برآں پیغمبرِ آخر الزماںؐ کا پورا دورِ رسالت دعاؤں میں قلمبند ہے۔

یہ اجمال چونکہ خاصی تفصیل کا طالب تھا لہذا آنحضرت کا دور الگ وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا۔

عہدِ رسالتمآبؐ کا نفسیاتی جائزہ

کتاب اللہ کی داخلی شہادت اور شانِ نزول کی روایات سے یہ حقیقت اُجاگر ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم عموماً حوادثِ حیات (Life Situations) کے مطابق نازل ہوا ہے یعنی عہد رسالت مآبؐ میں جو مسائل پیدا ہوتے تھے، ان کو حل کرنے کی خاطر، ان سے متعلق ہدایات کی آیات نازل ہو جایا کرتی تھیں۔

اس لحاظ سے سیرتِ نبویؐ یعنی عہد رسالت مآب اور قرآن کا چولی دامن کا ساتھ ہے

ا، ابتدائے عہد

اگر محققین کے ان نتائج تحقیق کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ جو انہوں نے قرآن پاک کی ترتیب نزولی کے سلسلے میں اخذ کیے ہیں تو مندرجہ ذیل دعائیں ابتدائی عہد میں محسوب ہونگی۔

- ـــــ اھدِنا الصراط المستقیم... الخ سورہ ۱ الفاتحہ
- ـــــ رَبِّ اشرح لی صدری... الخ سورہ ۲۰ طٰہٰ
- ـــــ رَبِّ لاتذرنی فرداً وانت خیرُ الوارثین سورہ ۲۱ الانبیا

صراطِ مستقیم کی ہدایت ہی دین کی غرض وغایت ہے، چنانچہ اس کی طلب کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔ یہ دعا نہ صرف ایک دُعا ہے بلکہ اس میں صراطِ مستقیم کی بھی نشاندھی کر دی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کا جادۂ حق ہے کہ جو انعام الہیٰ کے مستحق قرار دیے گئے ہیں نہ کہ گمراہوں کا اور نہ ان لوگوں کا کہ جو غضبِ الہیٰ کا شکار ہوتے۔

آنحضرتؐ کی یہ دُعا قبول ہوئی اور صراطِ مستقیم کی جامع گائیڈ قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوئی۔

ذٰالِكَ الكِتٰبُ لَارَیبَ فیهِ هُدًی لِلمُتَّقِین۔ (۲/۲)

جس قدر کوئی انسان عظیم ہوتا ہے، اسی قدر اس پر فرائض کا بار زیادہ ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ عظمی مرتبتؐ کے احساسِ فرض کی شدّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا

سکتا ہے کہ ایک بار مدینہ میں آپؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سورہ نساء کی تلاوت کرائی جب وہ اس آیت پر پہنچے کہ جس میں آپؐ کو تمام امتوں کے نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

فکیف اذا جئنا من کلِّ اُمّۃٍ بشھیدٍ وّجئنا بِکَ
علیٰ ھٰٓؤلآءِ شھیدًا ۴/۴۱

تو آنحضرتؐ نے مضطرب ہو کر فرمایا "ابن مسعودؓ بس کرو"

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے۔ میں نے دیکھا کہ سرورِ دو عالم کی آنکھیں اشکبار ہیں اور آپ برابر آنسو بہاتے جا رہے ہیں۔ (فداہ ابی وامی)

چنانچہ آنحضرتؐ کو جب تمام انسانوں کی ہدایت کا فریضہ سپرد کیا گیا، تو بارِ رسالت کی گراں باری اور احساسِ ذمہ داری کی شدت نے آپ کو مضطرب بنا دیا۔ لوگوں کی طرح طرح کی باتوں سے بھی دل تنگ ہونے لگا۔ جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے۔

ولقد نعلم انّک یضیق صدرک بما یقولون ۱۵/۹۷

ان حالات میں حضرت موسیٰؑ کی شرحِ صدر اور تسہیلِ امر کی دُعا نے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ "مثیلِ موسیٰؑ" نے اپنے لیے بھی یہ دُعا مانگی اور یقیناً یہ قبول ہوئی۔ اس قبولیت پر الم نشرح لک صدرک کی آیت شاہد ہے۔

مختلف انبیاءِ کرام کی دعائیں آنحضرتؐ پر نازل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ بھی وہ دعائیں مانگیں اور آپ کا دل جما رہے۔ صرف دعائیں ہی نہیں بلکہ سارا قرآن اسی انداز سے اُترا ہے۔ چنانچہ متفرق طور پر نازل کرنے کی علت نمائی بیان کرتے ہوئے ارشاد قدرت ہوتا ہے۔

کذالک ج لِنُثبّت بہٖ فؤادک ورتّلناہ ترتیلا (۲۵/۳۲)

ہاں ہم نے قرآن کو متفرق طور پر نازل کیا ہے تاکہ تیری دل جمعی ہو اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سنایا ہے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ نے اپنی معاونت کے لیے حضرت ہارونؑ کو شامل دعا کیا تھا، آنحضرتؐ نے اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حق میں یہ دُعا فرمائی اور بعد ازاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بیٹوں کے نام حضرت ہارونؑ کے بیٹوں کے

نام پر رکھے۔

آنحضرتؐ نے پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تھی اور ان سے چار بیٹیاں بھی ہوئیں۔ مگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہوئی۔

ادھر معاندینِ اسلام کو موقعہ ملا اور انہوں نے آنحضرتؐ کو اَبتر (بے اولاد) کہنا شروع کر دیا۔ یہ طعنے سن کر آنحضرتؐ کے دل پر جو گذرتی ہوگی، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جنہیں ایسے رُوح فرسا حالات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

یہ چرکے ایسے تھے کہ جن کا مداوا اس عظیم خاتون کے پاس بھی نہ تھا کہ جو ہر حال میں آنحضرتؐ کی مونس و غمخوار تھی۔

ایسے میں دُعائے زکریاؑ سے بڑھ کر اور کیا وجہ تسکین و طمانیت ہو سکتا تھا؟

اللہ تعالیٰ نے قلبِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر القاء فرمایا اور آپ کے لبوں پر

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ

پالنے والے! مجھے اکیلا نہ چھوڑنا، بے شک تو بہترین وارث ہے۔

کے الفاظ دُعا کا رُوپ دھار گئے۔

اس دُعا کے جواب میں سورہ کوثر نازل ہوئی۔ جس میں آنحضرتؐ کو بہت کچھ عطا کیے جانے کا تذکرہ تھا اور دشمن کی ابتری اور انقطاعِ نسل کی پیش گوئی تھی۔

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

یَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۔ (۳۶/۳۰)

(ب) دَورِ تکذیب

جب آنحضرتؐ نے کفرزارِ عرب میں اعلانِ نبوت فرمایا تو مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ تکذیب کے لیے وہی طور طریقے برتے گئے، جو اس سے پہلے استعمال میں آ چکے تھے۔ کتاب اللہ اس دور میں برابر یاد دلاتی ہے کہ آنحضرتؐ اور ان کے پیروکار ہرگز ہراساں اور پریشان نہ ہوں۔ کیونکہ جھٹلایا جانا کوئی نئی بات نہیں۔ انبیاء سابق بھی اس سے دوچار ہو چکے ہیں۔ کتاب اللہ میں اس دَور میں خصوصاً انہی انبیاء کرام کا

تذکرہ آیا ہے اور انہی کی دعائیں بیان ہوتی ہیں کہ جو بہت زیادہ جھٹلائے گئے تھے۔

اور حضرت نوحؑ ان میں سرِفہرست ہیں۔

کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ (۳۸/۱۲)

دشمنانِ دین و دانش نے حضرت نوحؑ کو جھٹلانے کے لیے اُنہیں (نعوذ باللہ) پاگل اور مجنُون کہا۔ دھمکیاں دیں اور اس بات پر خاص طور پر تمسخر کیا کہ ان کے پیروؤں کی جماعت مسکینوں پر مشتمل ہے۔ مزید یہ بھی کہا کہ اگر خُدا نے بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتے کو بھیجتا۔

بعینہٖ یہی حربے آنحضرتؐ کے خلاف بھی آزماتے گئے، آپ پر وہی الزام عائد کیے گئے اور ویسے طعن کے تیر پھینکے گئے کہ جن کا حضرت نوحؑ نشانہ بنے تھے۔ نیز فرشتے بھیجنے کا اظہار آنحضرتؐ کے سامنے بھی کیا گیا۔

حضرتِ نوحؑ کا اندازِ دفاع اور دعائیں نفسیاتی لحاظ سے اس دَور کے حسبِ حال تھیں چنانچہ ان کی دعائیں بڑے شد و مد کے ساتھ اس دور میں نازل ہوتیں ہیں۔

اسی دَور میں حضرت شعیبؑ کی تکذیب کا ذکر بھی آیا ہے کہ جس میں دشمنوں نے دھمکی دی تھی۔

اے شعیبؑ اگر تمہارے قبیلے کا لحاظ نہ ہوتا تو تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا!

آنحضرتؐ کو بھی قوم نے ایسی ہی دھمکی دی اور آپؐ نے حضرت شعیبؑ کی طرح کی

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ

دُعا ورد زبان کر لی جو مستجاب ہوتی۔

ج ہجرت

ہجرت آنحضرتؐ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے چنانچہ اس کی اطلاع قرآن پاک نے پہلے سے دے دی تھی۔ گو یہ اطلاع صراحتاً نہیں تھی۔ کیونکہ مصلحت کا تقاضا تھا کہ اسے پردۂ اخفا میں رکھا جائے۔

صحابۂ کرامؓ اس اطلاع سے باخبر تھے خصوصاً مزاج شناسِ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ تو اس کی تفصیل سے بھی آگاہ تھے۔ کیونکہ آنحضرتؐ خود ہجرت کی طرف اشارہ فرما چکے تھے۔

قرآن مجید میں، ہجرت سے پہلے کی متعدد سورتوں میں سیروا فی الارض کا حکم آیا ہے اور اس

کے بین السطور میں ہجرت کا حکم ہے۔

مزید برآں ان ایام میں حضرت یوسفؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ مستضعفینِ عہد موسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کی دعائیں بیان ہوتی ہیں۔ جب کہ ان انبیاء کرام کو ہجرت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ مثلاً حضرت آدم کی ہجرت بہشت سے اس زمین کی طرف تھی۔ حضرت نوحؑ کو بھی اپنے پہلے ماحول کی تخریب کے بعد نیا ماحول تیار کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیمؑ نے خود کو مہاجر کہا۔ (۲۹) اور نہ صرف خود مختلف مقامات کی طرف ہجرت کی۔ بلکہ اپنے بیٹے اور بیوی کو بھی اس سنت پر چلنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ انہیں بیت اللہ کے پاس بے آب و گیاہ ویرانے میں نئی بستی بسانے کی خاطر چھوڑ گئے۔

یہ سب دعائیں ہجرت سے متعلق ہیں چنانچہ مستضعفینِ عہد موسیٰؑ کی دعا کا مقصد دارالکفر سے نجات ہے اور اسلامیانِ مکہ بھی ایسی ہی نجات کے آرزومند تھے۔

حضرت نوحؑ کی اس دور میں وہ دعا بیان ہوئی ہے کہ جس میں ان کے لئے لنگر اٹھانے کا تذکرہ ہے اور آنحضرتؐ بھی یثرب کے لیے آمادۂ سفر تھے۔

ہجرت کے وقت آنحضرت کے لیے یہ دعا نازل فرمائی۔

رَبِّ اَدخلنی مُدخَلَ صدقٍ واخرجنی مخرج صدقٍ

کہ جس میں مخرج صدق سے مراد مکہ سے بحفاظت نکلنا اور مدخل صدق سے مراد مدینہ میں بخیریت داخلہ ہے۔ آنحضرت شہر مکہ میں امن کے خواہاں تھے۔ تاکہ ہجرت کے وقت خونریزی کی نوبت نہ آتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی وہ دعا دھرائی کہ جس میں انہوں نے مکہ میں جائے امن ہونے کی خواہش کی تھی۔

حضرت یوسف نے کچھ دنوں کے لیے قید زنداں میں رہنا قبول کیا تھا اور انہوں نے جو دعا مانگی تھی، اس دور میں اس دعا کا اعادہ بھی ہوا ــ اور اس سے غالباً آنحضرتؐ کے غارِ ثور میں قیام کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت یوسفؑ کی اس دعا کا دوسرا جزء صالحین سے ملاقات کی خواہش پر مبنی ہے۔ اس سے آنحضرتؐ کا مسلمانان مدینہ بالخصوص عقبہ اولیٰ وثانیہ کے بیعت کرنے والے صالحین سے ملاقات اور ملاپ مراد ہو سکتے ہیں۔

(د) مدنی دور

ہجرت کے بعد یثرب میں ملتِ خفتہ کے احیاء کے امکانات بہت روشن ہو گئے۔ کیونکہ یثرب کا نام بدل کر رسول اکرمؐ کے نام پر مدینۃ الرسول (رسول کا شہر) ہو گیا تھا۔ اور عہد نامہ مدینہ نے قیام ملک و ملت کی بنیادیں قائم کر دیں۔

چنانچہ اسی عہد میں دعائیں بھی اسی مضمون کی نازل ہوئیں کہ جن میں ملت کے قیام اور حکومت کا تذکرہ تھا۔

مثلاً حضرت ابراہیمؑ کی وہ دُعا دہرائی گئی کہ جو انہوں نے تعمیر کعبہ کے موقعہ پر مانگی تھی اور جس میں بنو اسماعیل میں سے امت مسلمہ کے قیام اور پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کی آرزو کا اظہار تھا۔ یہ دعائے ابراہیمؑ محققین کے اندازے کے مطابق ہجرت کے پہلے سال میں نازل ہوئی۔

ہجرت کے دوسرے سال میں غزوہ بدر پیش آیا جس میں ۳۱۳ حق پرستوں نے حصہ لیا اور یہ تعداد حضرت طالوتؑ کے مجاہدین کے برابر تھی کہ جو پہلے زمانے میں اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر میدان جہاد میں نکلے تھے۔ چنانچہ اس سال میں حضرت طالوتؑ کے اصحاب کی دُعا نازل ہوئی جس میں صبر و استقامت اور کافروں کے خلاف نصرت ربانی کی طلب تھی۔

غزوہ بدر کے بعد آنحضرتؐ نے اپنی چہیتی بیٹی فاطمہ زہرارضؓ کا نکاح اپنے عم زاد حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کیا۔

ان دنوں قرآن پاک نے پھر حضرت زکریاؑ کی دُعا کا اعادہ کیا ہے کہ جس میں ذریت طیبہ (پاک باز اولاد) کی تمنا ہے۔ یہ دُعا آنحضرتؐ کے دل کی آواز تھی۔ چنانچہ آنحضرت کی پاکیزہ نسل کا سلسلہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضؓ سے شروع ہوا۔

مدنی عہد کے پہلے دو برسوں میں مسلمانوں کو دُنیا اور آخرت کی بھلائی کی دُعا مانگنے کی تلقین کی گئی اس طرح سے اچھی زندگی اور اچھی آخرت اسلامی معاشرے کا رہنما اصول ٹھہرا۔

ہجرت کے تیسرے سال اُحد کی جنگ کا حادثہ پیش آیا اور مسلمانوں نے مدینہ سے نکل کر قریش کا مقابلہ کیا۔ سوئے اتفاق اور کسی قدر غفلت کی وجہ سے مسلمانوں کو اس میں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر مسلمان بہت دل برداشتہ تھے۔

اس وقت قرآن پاک نے ربّانی مجاہدین کی دُعا بیان کی ہے کہ جو اپنی لغزشوں کی معافی

ثابت قدمی اور نصرتِ ربانی کی دُعا مانگتے ہیں۔

غزوۂ خندق کے بعد مدینہ مسلمانوں کے لیے کسی حد تک اُن کی جگہ بن چکا تھا مگر جو لوگ ابھی مکہ میں رہ گئے تھے ان کی زندگی اجیرن تھی۔ مشرکین نہ تو انہیں مدینہ جانے دیتے تھے اور نہ ہی مکہ میں آرام سے رہنے دیتے تھے۔ عجیب قسم کی قید کی زندگی تھی۔

اس وقت صرف دعائیں ان کے سہارے کا باعث تھیں۔ چنانچہ وہ لوگ نجات اور نصرت الہٰی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس عہد میں ان کی اس دعا کو ریکارڈ کیا ہے۔

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝

اے ہمارے رَبّ! ہمیں اس بستی سے نکال کہ یہاں کے لوگ جفاپیشہ ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی والی مقرر فرما اور اپنی طرف سے کوئی مددگار بھیج۔

مدنی دور کے آخر میں اصحابِ محمدؐ رضوان اللہ علیہم کی ایک اہم دُعا بیان ہوئی ہے کہ جس میں تکمیلِ نور کی خواہش ظاہر کی گئی ہے۔

بلاشبہ نور کامل ہو کر رہا اور اللہ تعالیٰ نے الیوم اکملتُ لکم دینکم کی مہر ثبت کر دی یہ نور، نورِ ہدایت تھا کہ جو دین کی تکمیل کا باعث ہوا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کی وہ خواہش بھی پوری ہوئی کہ جو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے متعلق ظاہر کی تھی کہ جس میں اس کے کامل بننے کا ذکر تھا۔

حکمت عملی

بشیری اور نذیری ملکوتی سیاست کے اصل اصول ہیں۔ جب ان دونوں اصولوں پر عمل کیا جائے گا تو اعلائے کلمۃ الحق کے نصب العین میں کامیابی یقینی ہوگی۔

قرآنی دعاؤں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں بشارت اور تنذیر کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

۱۔ تنذیر

تنذیر (ڈرانے) سے دین حق کے معاندین کے حوصلے پست کیے جاتے ہیں اور یہ چیز مشرکین کی نفسیات میں داخل ہے کہ وہ ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بددعا سے بہت خوف کھاتے ہیں اور ناگہانی آفات سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ کیونکہ شرک ہمیشہ عجز و انفعالیت اور ادنیٰ چیزوں سے خوف سکھاتا ہے۔

پس مکی عہد میں مصلحت کے مطابق قرآنی دعاؤں میں تنذیر کا پہلو بہت نمایاں ہے آنحضرتؐ کو بھی قرآن نے یہاں اکثر و بیشتر نذیر اور منذر کے القاب سے یاد کیا ہے۔

مثلاً نوح، المدثر، الملک، النجم، الذاریات، القمر، حم، مریم، الکہف اور النباء وغیرہ سورتوں میں لقب نذیر استعمال ہوا ہے اور سورہ والصافات، والنازعات، ق، ص، الرعد، وغیرہ میں لقب منذر آیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّ مَا مِنْ اِلٰـهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

علاوہ ازیں اس دور میں ان انبیائے کرام کا بہت تذکرہ آیا ہے کہ جو منذر بن کر آئے تھے اور جن کی شخصیت میں جلال غالب تھا اور جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں حق کا بول بالا کیا تھا۔ اور دشمنان حق کو بالآخر تائید ایزدی سے کیفر کردار کو پہنچایا تھا۔ مثلاً حضرت لوطؑ، حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ کی دعائیں بیان ہوتی ہیں۔ ان سب بزرگوں نے نصرت حق کی خواہش کی تھی۔ چنانچہ انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور دین حق کے دشمن

نہ صرف خائب و خاسر رہے۔ بلکہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

قد جاء الحق وزھق الباطل ، اِنّ الباطِلَ کَانَ زھوقا

جب یہ دعائیں مشرکین عرب کے سامنے دہرائی گئی ہوں گی تو یقیناً ان کے دل اپنے انجام بد سے دہل گئے ہوں گے اور دشمن کے دل میں خوف کا بیٹھ جانا ہمیشہ کامیابی کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تنذیر کا یہ حربہ، حق کے غلبہ کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔

اسلام دراصل صلح اور آشتی کا مذہب ہے اور وہ ہمیشہ، لڑائی جھگڑوں کے تصفیہ میں ان ذرائع کو ترجیح دیتا ہے کہ جن میں خُون خرابہ نہ ہونے پائے۔

چنانچہ غزوہ بدر سے پہلے شام کے تجارتی راستے کی ناکہ بندی اسی لیے کی گئی کہ قریش مکہ کو اس امر کا احساس ہو جائے کہ اگر مسلمانانِ مدینہ پر حملہ کیا گیا تو وہ اس تجارتی راستے کو روک کر ہمیں اقتصادی لحاظ سے تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

اگرچہ ابوجہل کی جہالت کی وجہ سے اہلِ مکہ نے اتنی دور اندیشی سے کام نہ لیا اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور مُنہ کی کھائی۔

صلح حدیبیہ کے بعد عمرہ کے موقع پر طواف کرتے ہوئے مسلمانوں کو آنحضرتؐ نے اسی مصلحت کے پیشِ نظر یہ حکم دیا تھا کہ وہ گردن نکال کر، کندھے ہلا کر چلیں اور رسب سے بڑھ کر فتح مکہ پر ایسی حکمت عملی پر عمل کیا گیا کہ مکہ سے کچھ دور، دُور مقامات پر آنحضرتؐ نے اپنی فوج کو منتشر کر کے آگ جلانے کا حکم دیا۔ یہ رات کا وقت تھا اور مقصد یہ تھا کہ دشمن دیکھے تو سمجھے کہ بہت بڑا لشکر ہے اور مرعوب ہو جائے اور اس طرح سے تلوار چلانے کی نوبت نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابوسفیان نے دیکھا تو ہراساں ہوتے بغیر نہ رہ سکا۔

ب ۔ بشارت

یہ دعائیں ایک طرف اگر تنذیر کا کام کر رہی تھیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو بشارت بھی دے رہی تھیں کہ انجام کار وہ لوگ ضرور غالب ہوں گے۔ کیونکہ جب بھی حق پرست حق کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اٹھے ہیں تو حق کو ہمیشہ غلبہ اور سربلندی حاصل ہوئی ہے یہی سنتِ الہٰی ہے۔

جب پہلے ہادیان اور پیروان حق کی دعائیں مستجاب ہوتی رہی ہیں تو آنحضرتؐ اور

آپؐ کے صحابہؓ کی کیوں کر نہ ہوں گی۔؟

دعاؤں کے اس نفسیاتی تاثر نے صحابہ کرامؓ کے قلب واذہان پر گہرے نقوش چھوڑے اور اس طرح انہیں اپنی کامیابی اور کامرانی کا بھرپور یقین ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ حالات اگرچہ انتہائی ناسامد تھے اور کامیابی کی بظاہر موہوم امید بھی نہ تھی مگر وہ صاحب عزیمت لوگ کبھی یاس وقنوط کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتے۔ عرب کا ذرہ ذرہ گواہی دے گا کہ ان لوگوں کے حوصلے کوہ آسا تھے۔ یقیناً اس استقلال میں دعاؤں کے سہارے کا بھی حصہ ہے۔

انبیائے سلف کے قصص اور دعاؤں کا بیان یقیناً آنحضرتؐ اور پیروانِ اسلام کی تسلیٔ خاطر کے لیے تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قصص کی توجیہہ یہی بیان فرمائی ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ ٱلرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ ۱۱/۱۲۰

یعنی انبیا کے سارے قصے جو ہم تمہارے علم میں لاتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے دل اس سے مضبوط کریں۔

مزید ان دعاؤں کے ذریعے وہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جس کا دیا جانا، اس وقت اشد ضروری تھا۔ اس طرح سے ہر مہم اور ہر دشواری کے وقت ہدایات کا مل جانا اہلِ ایمان میں اطمینان اور یقین کا باعث ثابت ہوا۔

یہ دعائیں یقیناً حوصلہ افزا تھیں۔ کیونکہ قادر مطلق خود ابتلاؤں سے بچنے کے طریقے بیان کر رہا تھا۔

پیشگوئی

پیش گوئی کرنا انبیائے کرام کے خصائص میں سے ہے بلکہ علمائے نحو کے نزدیک نبی (ہمزہ کے ساتھ) کا لفظ ہی نبا سے نکلا ہے۔ جس کے معنی خبر دینے او پیشگوئی کرنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ وہ سب پیشگوئیوں سے بھری پڑی ہیں۔ مگر جہاں تک محض دعاؤں میں پیش گوئی کا تعلق ہے۔ صحف سلف اگرچہ اس کے وجود سے خالی تو نہیں تاہم جس قدر اہتمام قرآن پاک میں کیا گیا ہے۔ ایسا پہلے نہیں ہوا تھا۔ قرآن مجید میں جس قدر دعائیں وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے اکثر یا تو صراحتاً پیش گوئی کرتی ہیں یا ان کے بین السطور میں پیش گوئیاں مضمر ہیں جنہیں اہل نظر بخوبی جانتے ہیں۔ غلبۂ حق یعنی کفار عرب کی ہزیمت و شکست اور پیروان اسلام کی فتح و نصرت ایک مہتم بالشان پیش گوئی ہے کہ جسے قرآنی دعاؤں نے اپنا موضوع بنایا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پیش گوئی بالآخر پوری ہوئی۔ حق سربلند ہوا اور باطل نے شکست فاش کھائی۔

قَدْ جاء الحق وزھق البا طل اِنّ البا طل کان زھوقا

سورہ یوسف اور سورہ آل عمران وغیرہ کی دعاؤں کی پیش گوئیوں کے ذریعے سے اس امر کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا کہ آنحضرتؐ ایک نئی عالم وجود میں آنے والی مملکت کے سربراہ (Heed of the State) بھی بننے والے ہیں۔

اسی طرح دعاؤں سے اور کئی ایک اہم واقعات مثلاً ہجرت، غار میں پناہ لینا، فتح مکہ اور غزوہ بدر کے متعلق پیش گوئی کا قرینہ نکلتا ہے۔ جس سے راسخ العلم صحابہؓ بخوبی باخبر تھے۔

ترمذی کی ایک حدیث کے مطابق ہجرت کے وقت رَبِّ ادخلنی مدخل صدقٍ واخرجنی مخرج صدقٍ کی دُعا نازل ہوئی تھی۔

اور الضحاک کے تفسیری بیان میں مخرج صدقٍ سے مراد مکہ میں سے مشرکین سے باحفاظت نکلنا اور مدخل صدقٍ سے مراد دوبارہ مکہ میں فتح و نصرت کے ساتھ داخلہ ہے تفسیر کا یہ پہلو صحیح ہے۔

قل جاء الحق و زھق الباطل، انّ الباطل کان زھوقا کی آیت موجود ہے۔

ابن مسعودؓ کی صحیح روایت کے مطابق آنحضرتؐ فتح مکّہ کے روز بتوں کو ایک چھڑی سے گراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ (ترمذی۔ بخاری مسلم)۔
مکہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ گویا اس فتح کی پیش گوئی رَبِّ ادخلنی مدخل صدقٍ کی دعا نے آٹھ سال پیشتر کر دی تھی۔

سلف صالحین کی سیرت

طلب اور دُعا سے مانگنے والے کی سیرت کی آئینہ داری ہوتی ہے چنانچہ قرآنی دعائیں انبیاء کرام اور صالحین کی صفاتِ حمیدہ کا بہترین مرقع پیش کرتی ہیں۔

قرآنی دعاؤں میں کردار کی مندرجہ ذیل خوبیاں قابلِ ذکر ہیں۔

ا۔ عزیمت

عزیمت انسان کا اعلیٰ و ارفع وصف ہے اور اس وصف کو انبیائے کرام اور سلف الصالحین کے ہر فرد میں موجود پاتے ہیں۔ کیونکہ نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ باہمت لوگ باطل کی ہر قوت سے ٹکرا گئے۔ مصائب و شدائد کے پہاڑ ٹوٹے مگر انہوں نے ہرگز حوصلے نہ ہارے ظاہراً فتح و کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ مگر انہوں نے دین میں مداہنت گوارا نہ کی

ب۔ توکّل

اگرچہ انبیائے کرام اور ہمارے اسلاف مادی لحاظ سے بے سروسامان تھے۔ مگر خدا پر توکل ان بزرگوں کا سہارا تھا۔ اسی سہارے پر یہ مقدس ہستیاں بڑی بڑی طاغوتی طاقتوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ حضرت یوسفؑ، حضرت ایوبؑ اور اصحاب موسیٰؑ کی دعائیں توکل کا خصوصی طور پر تذکرہ کرتی ہیں۔ اصحاب موسیٰؑ نے علی اللہ توکلنا کہہ کر دُعا مانگی ہے۔

ج۔ یقینِ محکم

اللہ تعالیٰ کی قدرت، اپنی حقانیت اور دُعا کے قبول ہونے پر ان سب شخصیتوں کو یقینِ محکم تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا میں اِنَّ رَبِّی لَسمیع الدُّعَا (بیشک میرا رب دعاؤں کے سننے والا ہے) اور عسیٰ اَنْ لَّآ اکون بدُعَآءِ رَبِّی شَقِیًا ﴿۴۸﴾ (مجھے یقین ہے کہ میں اپنے پروردگار سے دُعا مانگ کر محروم نہیں رہوں گا) کے جملے ان کے یقینِ کامل کو ظاہر کرتے ہیں۔

اسی طرح حضرت زکریا کی دُعاؤں میں انکَ سمیع الدُّعاء (بے شک تو دعاؤں کے سننے والا ہے) اور لم اکنُ بدعائكَ ربِ شقیا (اے رب میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر محروم نہیں رہا) کے جملے موجود ہیں۔

للّٰہیت

انبیاء علیہم السلام کی زندگیاں تمامتر رضائے الہٰی کے لیے وقف تھیں۔ چنانچہ ان کی محبت اور عداوت بھی ذاتیات سے بلند تھی۔ وہ لوگ کسی سے محبت رکھتے تھے، تو خُدا کے لیے اور عداوت رکھتے تھے تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر ان میں ذاتی خواہشات کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں نے ہمیشہ ذاتی انتقام لینے سے احتراز فرمایا ہے۔ انبیاء میں سے حضرت نوح علیہ السلام بہت زیادہ ستائے گئے۔ مگر اُنہوں نے بھی جب کفار کی تباہی کی بدُعا کی تو اپنی ایذا رسانی کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

خدایا! اگر تُو نے اُنہیں چھوڑ دیا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔

قرآنی دعاؤں میں للّٰہیت، زیریں رَو (Under-current) کے طور پر کام کرتی ہے۔ یوں تو سب پیغمبروں کی دعاؤں سے ان کی للّٰہیت مترشح ہے مگر حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں تو خصوصاً اس امر کا شاہکار ہیں۔

آنحضرتؐ کا دعائیہ املان ان صلاتی ونسکی: لخ ... موقف کی تائید میں پیش ہے۔ للّٰہیت کی خصوصیت محض انبیائے کرام تک محدود نہیں۔ دیگر نیک لوگوں میں بھی یہ وصف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ربّانی مجاہدین اسی جذبہ سے سرشار تھے۔

فرعون کے عہد کے جن ساحروں نے عصائے موسیٰؑ کو دیکھ کر اعتراف شکست کیا تھا۔ انہوں نے بھی اس فضیلت سے وافر حصہ پایا ہے۔ ان کی اس قدر کایا پلٹ گئی تھی کہ ایمان لانے کے بعد جب انہیں سولی پر چڑھانے کی دھمکی دی گئی تو قطعاً ہراساں نہ ہوئے اور رضائے الٰہی کو منتہائے نظر سمجھتے۔ حالانکہ ان سے پہلے وہ پیشگی انعام کے لیے پُرزور اصرار کرتے رہے تھے۔

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ

انبیاء علیہم السلام درحقیقت للّٰہیت کی اس منزل میں ہوتے ہیں کہ اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ

ایک ایک سانس خُدا کے لیے وقف سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ حوائجِ ضروریہ اور کھانے پینے میں بھی جو وقت صرف ہوتا ہے اس کے لیے وہ اپنے مالکِ حقیقی کے حضور اعتذار اور استغفار کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شافعِ روزِ محشر حضور سرورِ کائناتؐ دن میں ستر بار استغفار کیا کرتے تھے۔ حالانکہ انبیائے کرام گناہوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں۔

سچ ہے کہ

حسنات الابرارِ، سَیِّئات المقربین (عربی مقولہ)

سُپردگی

سُپردگی ذریعۂ نجات ہے اور سرمایۂ عبودیت، جب کہ خُدا کے سامنے غلطی کو درست ثابت کرنے کی کوشش سراسر شقاوت ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی سپردگی کی کیفیت انتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ بات بات پر خُدا کے سامنے استغفار کرنا اور سراپا اعتذار رہنا ان پاکبازوں کا شیوہ تھا۔

حضرت آدمؑ چاہتے تو شیطان کو موردِ الزام قرار دے دیتے اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب بھی ہوتے مگر نہیں انہوں نے خُدا کے سامنے سپردگی کا اظہار کیا اور استدلال کو تقاضائے عبودیت کے خلاف سمجھا تھا۔

اسی طرح حضرت نوحؑ اپنے بیٹے سے متعلق خُدا سے سوال و جواب کے بعد پوری سپردگی کے ساتھ مغفرت کی دُعا مانگتے رہے۔

قبطی کے کیفرِ کردار کو پہنچنے کے بعد حضرت موسیٰؑ کا اپنے لیے مغفرت و نجات کی دُعا مانگنا اسی مقصد کو واضح کرتا ہے۔

حضرت یونسؑ کی دُعا سے بڑھ کر اعترافِ لغزش، طلبِ مغفرت اور کمال سپردگی کی اور کوئی دُعا نہیں ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ سلف سے اس دُعا کی فضیلت میں بہت کچھ وارد ہوا ہے۔ اسے آیۂ کریمہ کا نام دیا گیا اور امام حسن بصری اور امام ابن جریر کے اقوال کے مطابق تو وہ اسم اعظم اس میں موجود ہے کہ جس کے ذریعہ جو دُعا مانگی جاتی ہے قبول ہوتی ہے۔

(ی) احساسِ فرض

دعاؤں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اپنے فرض کا بہت زیادہ احساس تھا یہی وجہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو اس سلسلے میں وہ بڑا اہم سمجھتے تھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت نے ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو سورۂ نساء کی تلاوت کرنے کے لیے فرمایا۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے کہ جس میں روز محشر امتوں کے نگرانوں کو بلایا جائے گا اور آنحضرتؐ ان پر نگرانِ اعلیٰ ہوں گے۔ تو آنحضرتؐ پر رقت طاری ہوگئی اور اُنھوں نے ابن مسعودؓ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور روتے رہے۔

انبیا کرام کو اپنی ذمہ داری کا احساس اس قدر تھا کہ اگر لوگ شرک سے باز نہیں آتے تھے اور تبلیغ موثر نظر نہیں آتی تھی تو خود اللہ تعالیٰ کے حضور میں بار بار استغفار کرتے تھے۔ حالانکہ بارگاہ قدرت کی طرف سے ان پر کوئی مواخذہ نہیں تھا رسول پر تو صرف پیغام کا پہنچانا فرض ہے اور بس! حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں حسب ذیل الفاظ ہیں۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ج وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۱۴/۳۶

جو میری اطاعت کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے، تو تو غفور اور رحیم ہے۔

نافرمانوں کا تذکرہ کرتے ہوتے خدا کو غفور الرحیم کا واسطہ دینے کی ایک توجیہہ بھی یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ اطاعت گذار نہیں بنے تھے۔ لہٰذا اپنے لیے حضرت ابراہیمؑ نے مغفرت طلب کی۔

(ک) جذبۂ تشکر

قرآنی دعاؤں سے یوں تو سب بزرگوں کے متعلق یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے شکر گزار بندے تھے مگر بعض تو اس لحاظ سے بہت ہی صاحب فضیلت واقع ہوتے ہیں۔ تحدیث نعمت اور اظہار تشکران کا موضوع بیان ہے اور اسے وُہ بجا طور پر ازدیاد نعمت کا باعث سمجھتے ہیں حضرت یوسفؑ دعا مانگتے وقت حکومت کے عطا کیے ہوتے اور تاویل حدیث کی تعلیم کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ بڑھاپے میں اسحاقؑ اور اسماعیلؑ کے عطا کیے جانے کو اللہ تعالیٰ کے خصوصی احسانات میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ اپنے اور والدین پر اہم احسانات کی وجہ سے زیر بار منت ہیں نیز دانش وہدایت کے حاصل ہونے کی وجہ سے خدا کے حضور میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ ۱۲

مسائل و معارف

(ا) انبیا معصوم ہوتے ہیں

قرآنی دعائیں عصمت انبیاء پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی اولاد کے لیے امامت کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عہدِ امامت ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء قطعاً ظالم نہیں ہو سکتے اور گناہ سے بھی معصوم ہوتے ہیں کیونکہ گناہ بھی ظلم کے دائرے میں آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک بہت بڑے گناہ یعنی شرک کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم کی دعا اجنبنی وبنیّ ان نعبد الاصنام کی قبولیت میں عصمت کی دلیل ہے۔ دعاؤں میں جہاں انبیا علیہم السلام نے گناہ سے اپنے کو نسبت دی ہے۔ وہاں ان الفاظ میں عام معنی مراد نہیں۔

جس طرح اھدنا الصراط المستقیم کہنے والے کے متعلق ہم یہ گمان نہیں کرتے کہ راہ راست پر نہیں بلکہ اس سے استقامت کی توفیق مراد لیتے ہیں۔

یا جس طرح حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اس دعا سے کہ جس میں اپنے مسلمان ہونے کی استدعا کی گئی ہے کوئی شخص یہ خیال خاطر میں بھی نہیں لا سکتا کہ نعوذ باللہ یہ بزرگ بھی حالت اسلام پر نہ تھے۔ بلکہ یہی مراد لیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس سے اس قدر فرمانبرداری اور تسلیم و رضا کی خواہش کی تھی کہ جس قدر اس کا حق ہے۔

(ب) اللہ کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے

قرآن پاک میں اس امر کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت ظاہر کرتی ہیں۔ شیطان سے بڑھ کر غضبِ خداوندی کا کون شکار ہوگا۔ مگر اسے بھی تا قیامت مہلت دی گئی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن پاک میں جہاں ہلاکتِ قوم لوطؑ کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے وہاں حضرت ابراہیمؑ کے

لیے ذریت طیبہ کی بشارت بھی موجود ہے۔

ہلاکت اگر غضب کا اظہار تھا تو ذریت طیبہ کی بشارت رحمت کا پرتو۔ دُنیا کو بُروں سے خالی کیا تو اچھوں سے بھر دی اور اس وقت یہی تقاضائے رحمت تھا۔

دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اَجر دیتا ہے

(ج) قرآنی دعائیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دُنیا میں نیک کاموں کا اُجر ملتا ہے۔ مثلاً ربانی مجاہدین کی دُعا کے جواب میں ارشاد قدرت ہوتا ہے۔

فاتھم اللہ ثواب الدنیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں دُنیا میں نصرت اور مال غنیمت عطا کیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی ومن ذُریتی کی قبولیت کے نتیجے کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

واٰتیناہ اَجرَہٗ فی الدُّنیا کہ ہم نے اس کا اجر اسے دُنیا میں دے دیا۔

(د) ابراہیمؑ سب مذاہب میں قابلِ احترام ہستی ہے

خلیل اللہ کی شخصیت ایسی ہے کہ ہر شخص کا محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے چنانچہ قرآن پاک نے بھی انہیں اُمّۃً قانتاً للہ کہہ کر یاد کیا ہے۔

آپؑ نے اپنی ایک دُعا میں ذکرِ خیر کی خواہش ظاہر کی تھی۔

وَاجْعَل لِّی لِسانَ صدقٍ فِی الآخرین

چنانچہ یہ دُعا قبول ہوئی۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہوتا ہے کہ ہم نے اسے دُنیا میں بھی اُجر دیا اور دُنیا میں اَجر سے مُراد تفسیر جلالین کے مطابق تمام مذاہب میں آپ کی تعریف اور ذکرِ خیر ہے۔ بلاشبہ ہر اُمت حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ مثلاً یہودی اپنی جگہ پر آپ کی تعریف کرتے ہیں اور عیسائی اپنی جگہ پر خلیل الرحمان کے ثنا خواں ہیں۔ مسلمان کی آپ سے عقیدت کی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ابراہیمؑ کی سیرت اسوۂ حسنہ اور ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی سرمایہ افتخار ہیں۔

نیز ہر نماز میں ابراہیم اور آلِ ابراہیم پر سلام بھیجنا ہر مسلمان کا مقدس فریضہ ہے۔

بعض کے نزدیک تو ہندو مت میں برہما کی ذات دراصل ابراہیمؑ ہی کی شخصیت ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ الخ

(۵) نبوت آلِ ابراہیم میں ہے

آزمائش میں کامیاب ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے منصب امامت سے نوازا تو انہوں نے اپنی اولاد کے لیے ومن ذریتی میری اولاد میں بھی یہ منصب ہو کہہ کر دُعا کی تھی کہ جو قبول ہوئی۔

پس اعلانِ قدرت ہوا

وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب ۲۹

یعنی ہم نے اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ تھے اور وہ دونوں نبی تھے ان کے بعد بنو اسحاقؑ میں سے نبی ہوتے رہے اور حضرت عیسیٰؑ اس سلسلے کے آخری نبی اور صاحب کتاب تھے۔ قدرت نے وعدے کی لاج رکھتے ہوئے انہیں قربِ قیامت تک زندہ رکھ چھوڑا ہے۔

اور بنو اسماعیل سے دعائے خلیل کے مطابق ایک پیغمبر نے ہونا تھا کہ جو باعتبار فضائل سب سے افضل ہے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ بنو اسماعیل میں سے مبعوث ہوئے اور کتاب سے بھی نوازے گئے۔ اس طرح سے آلِ ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں میں نبوت اور کتابِ قیامت تک کے لیے باقی رکھ دی گئی ہے۔

بنو اسحاقؑ سے حضرت عیسیٰؑ نبی اور صاحبِ کتاب آسمان پر زندہ ہیں اور
بنو اسماعیل سے آنحضرتؐ نبی ہیں کہ ان کی نبوت اور کتاب قیامت تک زندہ ہے۔

وسوسہ معارض ایمان نہیں ہے!

حضرت ابراہیمؑ کی دُعا احیائے موتیٰ کے الفاظ ولیطمئن قلبی سے مستفاد ہوتا ہے کہ وسوسہ معارضِ ایمان نہیں ہے۔

علامہ ابن کثیر، عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی ایک بار ملاقات ہوئی تو ابن عباسؓ نے ابن عمروؓ سے پوچھا کہ قرآن میں سب سے زیادہ امید پیدا کرنے والی کونسی آیت ہے"؟

ابن عمروؓ نے جواب دیا:۔ لاتقنطوا والی کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

"اے میرے گنہگار بندو! میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ میں سب گناہوں کو بخش دیتا ہوں"۔

اس پر ابن عباسؓ نے فرمایا۔ میرے نزدیک تو اس امت کی سب سے زیادہ ڈھارس بندھوانے والی وہ آیت ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کی دعائے احیاء موتی اور سوال وجواب پر مشتمل ہے۔

ز۔ رب العالمین گناہ اور کفر کی وجہ سے رزق بند نہیں کرتے

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی اولاد کے لیے امامت کی دُعا کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ عہدہ ظالموں کو ہرگز نہیں ملے گا۔ چنانچہ اسی تاثر کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے جب رزق ثمرات کی دُعا مانگی اور اُسے ایمانداروں تک محدود رکھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

"نہیں اگر لوگ کافر بھی ہوں گے روزی تو ان کی بھی بند نہیں کروں گا۔ متاعِ چند روزہ تو انہیں بھی میسر آتے گی۔ ۲/۱۲۶

ح۔ نجات محض اعمال پر نہیں بلکہ قبولیتِ اعمال پر ہے

ہم جو نیک عمل کرتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ مقبول بھی ہوں۔ کیونکہ بعض اعمال عمل کرنے والوں کے منہ پر مار دیے جاتے ہیں۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین نے عمل سے زیادہ عمل کی مقبولیت کا اہتمام ضروری سمجھا ہے۔ علامہ ابنِ کثیر اپنی تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دُعا۔

ربّنا تقبّل منّا ۲/۱۲۷

سے متعلق رقمطراز ہیں کہ دونوں بزرگ نبی نیک کام میں مشغول ہیں۔ مگر پھر بھی قبول نہ ہونے

کا کھٹکا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دُعا کرتے ہیں۔

حضرت وہیب بن دردؒ جب اس آیت کی تلاوت کیا کرتے تھے تو بہت رویا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

"آہ! خلیل الرحمٰن ایسے خدا کے مقبول پیغمبر، خدا کا اپنا کام اور خدا کے حکم سے ہی کرتے ہیں۔ یعنی خدا کا گھر، خدا کے حکم سے تعمیر کرتے ہیں مگر پھر بھی خدشہ ہے کہ کہیں قبولیت سے رہ نہ جائے"

سچ ہے مخلص مومنین کا یہی حال ہے۔ چنانچہ بروایت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ آپ نے "یُؤتُونَ مااتوا وقُلوبُہم وجِلۃ" کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ

"وُہ لوگ نیک کام کرتے ہیں، صدقے خیرات کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی خوفِ خدا سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سب اعمال قبول نہ ہوں۔"

اسمائے صفاتِ الٰہی

لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

قرآنی دعاؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ جب کوئی دُعا ختم ہوتی ہے تو آخر میں خدا کو اس کی اس صفت کا واسطہ دیا جاتا ہے کہ جس کا دُعا کے مرکزی خیال اور خواہش سے خصوصی تعلق ہوتا ہے۔ جو اسمائے صفاتِ الٰہی ان دعاؤں میں وارد ہوتے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

الوهّاب! اس کے معنی بہت زیادہ عطا کرنے والے کے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت سلیمانؑ نے بے مثال ملک مانگاہے تو اس صفت کو لاتے ہیں اور اسی طرح دانشور بے پایاں رحمتِ لدنّی کی خواہش کرتے ہیں تو اس صفت کا سہارا لیتے ہیں۔

وَلِیّ! ولی کے معنی دوست اور امور مصالح کے نگران کے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اللہ تعالیٰ کو دُنیا و آخرت میں اپنا ولی کہا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر اپنی دُعا میں ولی کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنی قوم کے لیے مانگی تھی۔

مَولیٰ! ولی اور مولیٰ کے معنی میں تھوڑا بہت فرق ہے مولیٰ کے معنی خاص آقا اور مالک کے ہیں۔ چنانچہ اہلِ ایمان نے خُدا کو اپنے مولا ہونے کا واسطہ دیا ہے اور امید کی ہے کہ ہم سے عفو، مغفرت اور رحم کا سُلوک ہو۔

مَالكَ الْمُلك! درحقیقت عزت اور ذلت خُدا کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہے ملک دے دے اصل اقتدار اسی کے قبضۂ قُدرت میں ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے حکومت حاصل کرنے کی خاطر جب دُعا کی تو اس صفت کے بین السطور میں دُعا کی۔

السمیع العلیم! السمیع کے معنی سننے والا اور علیم کے معنی جاننے والے کے ہیں۔ چنانچہ تعمیرِ حرم کرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے دُعا مانگی کہ جس میں خدمتِ حرم کی قبولیت کی دُعا تھی اور اس میں سمیع علیم کی صفت لا کر اس امر کا خُدا کے سامنے اظہار مطلوب تھا کہ جس مقصد کی خاطر یہ عمارت تعمیر کی ہے وہ پُورا ہو۔ کیونکہ خُدا دعاؤں کے سننے والا اور پوشیدہ مقاصد کو جاننے والا ہے۔

التواب الرّحیم! التواب سے مراد بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والے اور رحمت کے ساتھ رجوع کرنے والے کے ہیں اور رحیم سے مراد بالخصوص اپنے مخلصین پر مہربانی کرنے والے کے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے تھے اُنہوں نے تعمیر حرم کے بعد خدا کی بارگاہ میں دعا کی تو ان اسماء کو وسیلہ بنایا۔

غفور الرّحیم! حضرت نوحؑ اپنی دعا کے آخر میں خدا کا وصف غفور الرحیم اس لیے لائے ہیں کہ کافروں کی سزا کے مقابلے میں مومنوں پر رحمت اور شفقت کا اظہار ہو۔ جیسا کہ ایک اور آیت میں ارشاد قدرت ہوتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْد العقاب

حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنے نافرمانوں کی نافرمانی کا ذکر کرتے ہوتے خدا کو غفور الرحیم کہا ہے۔

العزیز الحَکیم! عزیز کا مطلب ہر چیز پر غالب ہے کہ اسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور حکیم اس کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی نہیں وہ ہر چیز کو اپنے محل پر ہی حکمت اور عدل کے ساتھ رکھتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اُمت مسلمہ میں مناسب وقت پر بعثت رسول کی دعا میں خدا کو اس لقب سے یاد کرتے ہیں اور ملائکہ بھی مومنین کی مغفرت کی دعا کے وقت اسی نام سے پکارتے ہیں۔

اَرحمُ الراحمین! بہت ہی زیادہ رحم کرنے والا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے دعا مانگتے ہوئے اور حضرت ایوبؑ نے بیماری سے نجات کی خاطر دعا مانگتے وقت اسی صفت کا سہارا لیا تھا۔

رؤفُ الرّحیم اہل ایمان کو خدا کے اس لقب سے بہت اُنس ہے۔ کیونکہ اس میں ترحم اور نرمی کا انتہائی وصف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اہل ایمان نے اپنی اور سابق ایمان والوں کی بخشش اور باہمی محبت کی دعا مانگی ہے تو اسے پیش نظر رکھا ہے۔ آنحضرتؐ کی صفات بھی قرآن پاک نے یہی بیان کی ہیں۔

سمیع الدعا: دعاؤں کے سننے والا، دعا خواہ اونچی آواز کے ساتھ ہو یا دھیمی آواز کے ساتھ۔
حضرت ابراہیمؑ اور حضرت زکریاؑ نے طلب طاہر اولاد نرینہ کی دعا مانگتے ہوئے اس صفت کا ذکر کیا ہے۔

الرحمٰن المستعان: وہ رحمٰن کہ جس سے مدد چاہی جاتی ہے۔
آنحضرتؐ نے کفار کے خلاف تائید ایزدی طلب کی ہے تو اسی صفتِ الٰہی کو دعا میں لاتے ہیں۔

خیر الراحمین: بہترین اور بہت زیادہ رحم کرنے والا، آنحضرتؐ اور اہلِ ایمان نے مغفرت اور رحم کی درخواست کی تو اسی وصف پر دعا کا خاتمہ کیا۔

خیر الغافرین بہترین انداز سے مغفرت کرنے والا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کی طرف سے مغفرت طلب کی ہے تو خدا کو خیر الغافرین کہا ہے۔

خیر المنزلین اس صفت سے مراد اچھی جگہ والا اور اچھی طرح اتارنے والا ہے۔ اسی لیے حضرت نوحؑ نے کشتی سے اترتے وقت اس صفت کو پیش نظر رکھا۔

خیر الفاتحین بہترین فتح دینے والا، چنانچہ حضرت شعیبؑ نے دعا مانگی کہ حق و باطل کی آویزش میں حق کی فتح ہو تو اسی صفت کے ذریعہ دعا کی۔

خیر الرازقین رزق دینے والوں میں سے سب سے اچھا رزق دینے والا۔
حضرت عیسیٰؑ نے آسمانی خوانِ نعمت کی درخواست کی تو آخر میں اس صفت کا تذکرہ کیا۔

خیر الوارثین جب حضرت زکریاؑ نے اپنے وارث کے لیے دعا کی تو اظہارِ ایمان کے طور پر ساتھ ہی کہہ دیا کہ حقیقی وارث تو اے خدا تو ہی ہے کہ جب تمام مخلوق فنا ہو جائے گی تو صرف تو ہی باقی ہوگا۔ تنہا نہ چھوڑنے کی دعا کے بعد آخر میں خیر الوارثین کہنا حسنِ طلب ہے اور اس وقت کی موزوں ترین ثنا ہے۔

علیٰ کل شیءٍ قدیر خدا قادرِ مطلق جو وہ چاہے ہو جاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے عزت و اقتدار کی خاطر دعا مانگی ہے تو یہ اعلان کیا ہے۔

باب پنجم

قرآنی دعائیں

انبیاء اور صالحین خدا کے حضور میں!

(ا) تعارف

(ب) مقامات ادعیہ

(ج) مقاصد ادعیہ

نمبر سورہ
نمبر آیات

(د) نفسِ دُعا

(ہ) اُردو ترجمہ

(و) افادات

ملائکہ کی دُعا

۱ اللہ تعالیٰ کی بخشش کا پروگرام دیکھئے۔ کس قدر وسیع ہے کہ اس امر کے لیے اس ذات نے اپنے مقرّب فرشتوں کی ایک کثیر جماعت مقرر کر رکھی ہے۔ جن کا ہر وقت کام - اہلِ ایمان کے لیے بخشش کی دُعا مانگنا ہے۔

حق تعالیٰ نے اس دُعا کو اپنی آخری کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ تاکہ مسلمان اسے دہرا کر ثواب حاصل کر سکیں۔

۲ مقام دُعا $\frac{۴۰}{۹-۷}$

۳ مقاصد دُعا

① توبہ کرنے والوں کے لیے مغفرت اور دخولِ جنت

② برائیوں سے ان کی حفاظت وصیانت

۴ **نفسِ دُعا:** ملاءِ اعلیٰ (Populus Sanctus) کے فرشتے جو حاملینِ عرش حافین حول العرش اور علیین پر مشتمل ہیں مومنوں کے لیے مندرجہ ذیل دعا مانگتے رہتے ہیں۔
رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ٥ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔

۵ ترجمہ: اے ہمارے پالنے والے! تیری رحمت اور تیرا علم سب پر حاوی ہے۔ پھر جن لوگوں نے توبہ کی ہے اور تیرے راستے پر چلتے ہیں، تو انہیں بخشش دے اور

انہیں دوزخ سے بچالے۔!

بارآلہا! ان لوگوں کو بہشتوں میں داخل کر، ایسے بہشت کہ جہاں حیات جاودانی کے مزے ہیں اور جن کا کہ تو نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے۔

اور ان کو بھی جنت نصیب کر کہ جو ان کے آباؤ اجداد، بیویوں اور اولادیں سے نیک ہیں بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور ان سب کو برائیوں سے بچا اور جس کو تو اس دن بچالے گا اس پر تو نے رحم کر دیا اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

۶ افادات

۱۔ انسان کا خونی رشتہ نیکی میں سودمند ہو سکتا ہے اور مقامات بلند کے حصوُل میں وراثتِ صالح بھی ممد و معاون ہے جیسا کہ اس دُعا سے مستفاد ہوتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال ہو تو پھر انسان کما حقہٗ برائیوں سے بچ سکتا ہے ورنہ نہیں۔ محض ذاتی اعمال پر بھروسہ کر لینا اور غرور زہد عبث ہیں۔

۳۔ توبہ نجات کی کُنجی ہے اور سرمایہ عبودیت ہے۔

حضرت آدمؑ و حوّاؑ کی دُعا

۱۔ شیطان کی جھوٹی قسم کھانے پر حضرت آدمؑ اور حواؑ فریب کھا جاتے ہیں کیونکہ یہ جھوٹی قسم پہلی بار ان کے سننے میں آئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں سے لغزش ہو جاتی ہے اور پھر دونوں کو عالمِ اسباب دُنیا میں بھیج دیا جاتا ہے کہ جو درحقیقت حضرت آدمؑ کا مقصدِ تخلیق تھا یاد رہے کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق اسی لیے ہوئی تھی کہ اُنہیں زمین پر خلیفۃ اللہ بنایا جائے۔ حضرت آدمؑ جب زمین پر آتے تو اپنے ترکِ اولیٰ کی بخشش کی کوشش میں لگے رہے۔ حتیٰ کہ معبودِ حقیقی نے اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرمایا۔

۲۔ مقامِ دُعا ۲۳/۷

۳۔ مقاصد

۱۔ اعترافِ لغزش
۲۔ طلبِ مغفرت
۳۔ رحم کی التجا
۴ خُسران سے نجات

۴ **دُعا**:۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔

۵ ترجمہ:۔ پروردگار ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا ہے اگر تو نے نہ بخشا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

۶ **افادات**:۔

۱۔ حضرت آدمؑ نے بخشش کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی اور اللہ تعالیٰ

نے خود یہ دُعا سکھادی۔

۲۔ رحمت اور بخشش سے محرومی خسرانِ مبین ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ دنیاوی معاملات میں مادی نقصان سے بچنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں مگر خُسرانِ آخروی کو درخورِ اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔

۳۔ ہمارے ماں باپ کا اسوۂ عمل ہمارے لیے موجود ہے۔ شرفِ آدمیت کا تقاضا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی غلطیوں کے لیے خُدا کی رحمت کی طرف رجوع کرے۔

حضرتِ نوحؑ کی دُعائیں

۱۔ حضرت نوحؑ کی حیثیت ایک منذر (ڈرانے والے) پیغمبر کی تھی انہوں نے سالہاسال تبلیغ کی۔ مگر سینکڑوں سال کی تبلیغ کا نتیجہ گنتی کے چند نفوس تھے جو ایمان لائے۔

قوم کی حالت زار پر اس قدر نوحہ خوانی کی کہ نام بھی نوح پڑ گیا۔ منکرین نے آپ کی تکذیب کی۔ برسرِ اقتدار سرداروں نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ مسکینوں کا ساتھ چھوڑ دیں تو ہم آپ کی طرفداری کریں گے۔ مگر آپ کب بھلا یہ بات مان سکتے تھے۔؟

اس پر سرداروں نے آپ کو غنڈوں سے زدوکوب کرایا۔ تنگ آکر آپؑ نے بددعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ چنانچہ ایک زبردست طوفان آیا اور وقت کے تمام فرعون غرق ہوگئے

قرآن پاک میں حضرت نوحؑ کی کئی ایک دعائیں وارد ہوئیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی ذات میں محض جلال نہیں تھا۔ بلکہ جمال بھی تھا۔

سلامٌ عَلیٰ نُوحٍ فِی العالمین ۳۷/۷۹

۲۔ مقاماتِ ادعیہ:۔ ۱۱/۱۴ ، ۲۳/۴۷ ، ۲۳/۲۶ ، ۲۳/۲۹ ، ۲۶/۱۱۸ ، ۵۴/۱۰ ، ۷۱/۲۶،۲۹

۳۔ مقاصد:۔

- اعترافِ مغلوبیت اور طلب مغفرت
- حق کی فتح
- دیارِ کفر کی تباہی
- دعوتِ حق کا ساتھ دینے والوں کی نجات
- کارسازِ حقیقی کے سہارے لنگر اٹھانا
- کشتی سے بحفاظت وباسعادت اترنا
- اپنی، اپنے والدین اور اہلِ ایمان کی بخشش
- خلاف رضا الٰہی دعا مانگنے پر استغفار

۳۔ دعائیں :۔ ۱۔ قوم نے تکذیب کی اور حضرت نوحؑ کو پاگل کہا تو آپؑ نے حسبِ ذیل دُعا مانگی :۔

رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۲۳/۲۶

خدایا ! جس وجہ سے وہ میری تکذیب کر رہے ہیں، تو اس میں میری مدد کر۔

۲۔ جب آپ کی بہت تکذیب کی گئی۔ پاگل اور مجنوں تک کہا گیا اور جھڑکا بھی گیا۔ تو آپ نے بارگاہ الٰہی میں التجا کی۔

اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۵۴/۱۰

پروردگار! اب تو میں مغلوب ہو گیا ہوں، پس تو ان سے بدلہ لے لے۔

۳۔ دعوت حق کو رد کر دینے کے بعد کفار نے داعیٔ حق کو دھمکی دی کہ اگر تم تبلیغ سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا اس پر آپ نے دعا مانگی۔

رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَ

بَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ ۲۶/۱۱۷،۱۱۸

اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میرے اور ان کے درمیان (فتح کے ساتھ) فیصلہ کر دے۔ نیز مجھے اور میرے ساتھ جو ایمان لانے والے ہیں، ان سب کو نجات دے۔

۴۔ حضرت نوحؑ جب بہت تنگ آ گئے تو یہ بددُعا کی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا

كَفَّارًا ۝ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّ

لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۝ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ۔ ۷۱/۲۶،۲۸

اے میرے رب! زمین پر کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ اگر تو نے چھوڑ دیا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نسل بھی جو ہو گی سو کافر اور فاجر ہو گی بارالٰہا! مجھے، میرے ماں باپ اور اس کو جو میرے گھر میں ایماندار ہو کر داخل ہو جائے اور باقی ایماندار مردوں اور عورتوں سب کو بخش دے۔

مگر ظالموں کو تو بربادی کے سوا اور کچھ زیادہ نہ کر۔

۵۔ بددعا پر اللہ تعالیٰ نے عذاب کے طور پر طوفان بھیجا اور حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔ جب کشتی تیار ہو گئی تو آپ نے مومنین کو سوار ہونے کے لیے کہا اور مزید یہ کہا

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰهَا ۗ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۱/۴۱

اللہ تعالیٰ کے نام سے میں لنگر اٹھاتا ہوں اور لنگر ڈالتا ہوں، بے شک میرا رب بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔

۶۔ حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹا جب طوفان کی نذر ہونے لگا تو حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نجات کی دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرا یہ بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں کیونکہ نافرمان ہے۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے اہل کی نجات کا وعدہ کیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے دعا مانگی۔ مگر جب وضاحت ہو گئی تو اس پر حضرت نوحؑ نے معذرت کی اور بخشش کی دعا مانگی۔

رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْــَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۱۱/۴۷

خدایا! میں اس بات سے تیرے حضور پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی بات کا سوال کروں جس کی حقیقت کا مجھے علم نہیں۔

اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور رحم نہ فرمایا تو میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو تباہ حال ہوئے۔

۷۔ جب حضرت نوحؑ کشتی سے اترے تو اس وقت یہ دعا مانگی۔

رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ

بارالہا! میرا اترنا بابرکت ہو، تو سب سے بہتر جگہ (دینے والا) ہے۔ ۲۳/۲۹

حضرت ابراھیمؑ کی دعائیں

۱۔ حضرت ابراہیمؑ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں یعنی سب میں مقبول ہیں۔ اہلِ عرب کو حضرت خلیل اللہ سے یہ خصوصی تعلق بھی تھا کہ اُنہوں نے کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی تھی نیز انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو کعبہ کے پاس آباد کیا تھا اور قریش انہی کی اولاد ہیں۔

سَلٰامٌ عَلٰی اِبْرٰاھِیْم

۲۔ مقاماتِ ادعیہ ۲/۱۲۶،۱۲۹ ، ۱۴/۳۵،۴۱ ، ۲۶/۸۳،۸۷ ، ۳۷/۱۰۰ ، ۶۰/۴،۵

۳۔ مقاصد ادعیہ

- بیت اللہ کی تعمیری خدمت قبول ہو۔
- ام القریٰ (مکہ) دار الامن بن جائے۔
- مناسکِ حج کی ہدایت
- جوارِ کعبہ میں رہنے والوں کے لیے فراخیٔ رزق
- رزق ثمرات بنو اسماعیلؑ کے لیے ہو
- اپنے اور اپنے اسماعیلؑ کے اسلام پر قائم رہنے کی خواہش
- نسلِ ابراہیمؑ سے ملّت اسلامیہ کی نمود
- آنحضرتؐ کی بعثت بنو اسماعیلؑ میں ہو
- لوگوں کے دلوں میں اسماعیلؑ اور بنو اسماعیلؑ کے لیے محبت ہو
- اپنے اور اپنی نسل میں اقامتِ صلوٰۃ
- صالح لڑکا پیدا ہو۔
- بڑھاپے میں اولادِ نرینہ پیدا ہونے پر شکر
- صالحین کی صحبت
- آخرین میں ذکرِ خیر

- وراثتِ بہشت
- کافروں کے تختۂ مشق ستم بننے سے نجات
- روزِ محشر حزن سے نجات
- حکم
- اللہ تعالیٰ کا رجوع برحمت
- طمانیت قلب کے لیے احیاء موتی کا تجربہ
- اپنی اپنے والدین اور اہلِ ایمان کی بخشش

۴۔ دعائیں

۱۔ حرمِ کعبہ کی دیواریں اُٹھا چکے تو حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر دُعا فرمائی

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۲/۱۲۷

اے ہمارے پروردگار! ہماری یہ خدمت قبول فرما (نیز جس مقصد کی خاطر ہم یہ عمارت بنا رہے ہیں، اس مقصد کو پُورا کیجئے گا) بے شک تو (ہماری دعاؤں کو) سننے والا (اور ہمارے پوشیدہ مقاصد کو) جاننے والا ہے۔

مزید یہ بھی دُعا کی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَاج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۲/۱۲۸، ۱۲۹

پالنے والے! ہمیں اپنا مسلمان (رضا شیوہ، فرمانبردار) بنائے اور ہماری اولاد میں سے ایک ملّت اسلامیہ (فرمانبردار جماعت) کا قیام ہو۔ ہمیں ہمارے حج کے طریقے بتادے اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔ بارالٰہا! اوران (بنواسماعیل) میں ایک رسول انہیں میں سے بھیج جو ان پر تیری آیات پڑھے، انہیں کتاب و دانائی سکھائے اور انہیں پاک کرے۔

غالب حکمت والا ہے۔

افادہ: حضرت سلام بن ابی مطیع فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ مسلمان تو تھے ہی لیکن وہ اسلام کی استقامت طلب کرتے تھے۔ جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا۔

قَدْ فَعَلْتُ یعنی میں نے تمہاری دعا قبول فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر)

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ مکرمہ، حضرت اسماعیلؑ اور بنو اسماعیل کے حق میں جو دعائیں کیں ان کی استجابت محتاجِ بیان نہیں۔ ہر شخص جو دیدہ بینا رکھتا ہے، وہ اچھی طرح باخبر ہے یہ آیات بینات ہیں اور ایمان والوں کے لیے ازدیاد ایمان کا باعث۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَ
بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ
النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَاۤ اِنِّيْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ
عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا
يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ اَلْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ
لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ
رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ
(۱۴ / ۳۵-۴۱)

اے میرے رب! اس شہر کو امن اور سلامتی والا بنادے۔ مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھ۔ اے میرے رب انہوں (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ پس جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس تو غفور الرحیم ہے۔ (بخشنے والا رحم کرنے والا)

اے ہمارے پالنے والے میں نے اپنی کچھ اولاد کو ویران بیابان میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے۔ تاکہ پالنے والے! وہ اقامتِ صلوٰۃ کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ پس لوگوں کے دل، ان کی طرف جُھکا (مائل کر) دے اور پھلوں کا رزق ان کو دے تاکہ تیرے شکر گذار رہیں۔

اے ہمارے پالنہار! بے شک تو جانتا ہے۔ جو کچھ ہم چُھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان پر۔ اللہ تعالیٰ کا (ہزار ہزار) شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دو بیٹے عطا کیے۔ بے شک میرا رب دعاؤں کے سُننے والا ہے۔

بارالٰہا! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے۔ اے میرے رب میری یہ دُعا قبول فرما۔

اے ہمارے ربّ! تو مجھے میرے ماں باپ کو اور ایمانداروں کو حساب قائم ہونے کے دن، بخش دے۔

افادات:-

۱۔ امام مجاہد اور حضرت ابن عباسؓ نے افئِدَۃً مِن النّاس کی تفسیر میں خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ من الناس کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ سب لوگ آل ابراہیمؑ کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان میں سے کچھ۔

اگر حضرت ابراہیمؑ من کے حرف کے بغیر افئدۃ الناس کہہ دیتے تو عرب، فارس روم، ترکستان اور ہندوستان بلکہ سب دُنیا کے لوگ آل ابراہیم کی محبت کا دم بھرتے۔ ۱

یہی نکتہ رَبِّ اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذُریتی میں پیدا ہوتا ہے۔ من ذریتی اس لیے کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اطلاع دے چکے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں کچھ لوگ ظالم بھی ہوں گے۔

۲۔ اس دُعا سے یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ بیت اللہ کے آباد کرنے کی خاطر لائے تھے تاکہ وہاں امامتِ صلوٰۃ کا

فریضہ ادا کرتے رہیں۔

۲۔ مکہ کے امن والے شہر کی دعا اس سے پہلے بھی حضرت ابراہیمؑ نے مانگی تھی۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ
مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۲/۱۲۵

پالنے والے! اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں ان کو رزق ثمرات دے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے مومنوں کی یہ تخصیص اپنی شان ربوبیت کے خلاف سمجھی۔

علامہ ابن کثیر کے نزدیک یہ تخصیص والی دعا حرمت کعبہ اللہ کے بنانے سے پہلے تھی اس لیے کہا کہ خدایا! اس جگہ کو امن والا شہر بنا، مگر جب بیت اللہ تیار ہو گیا اور شہر بس گیا۔ اور حضرت اسحٰقؑ جو حضرت اسماعیلؑ سے تین سال چھوٹے تھے، تولد ہو چکے تو یہ دعا مانگی۔ جس میں کہا کہ اس شہر کو امن والا بنا دے اور بیٹوں کی پیدائش کا بھی شکریہ ادا کیا۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ نے بڑھاپے میں دعا کی تھی۔ کیوں کہ اب تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۳۷/۱۰۰

افادہ:۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک حلیم لڑکے کی خوشخبری دی۔ کہ جس کے ساتھ قربانی کا واقعہ پیش آیا۔ یقیناً یہ حضرت اسماعیلؑ تھے کیونکہ وہی بڑے لڑکے تھے۔

۴۔ تبلیغ کے دوران حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے بعثت بعد الموت کے مسئلہ پر سوال اٹھایا کہ مرنے کے بعد جب جسم مٹی میں مل جائیں گے اور مٹی اڑ کر کہیں کی کہیں جا بکھرے گی تو پھر انسان کیسے زندہ کیے جائیں گے۔

اس پر حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔

رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ

پالنے والے! مشاہدہ کرا کہ تم مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہو؟

اس پر اللہ تعالیٰ نے پُوچھا کیا احیاء موتی پر تمہارا ایمان نہیں ؟
حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا۔ ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اطمینان قلب کے لیے
یہ مشاہدہ چاہتا ہوں۔ ۲۶۰/۲

(۵) رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ
لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝
وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ
يُبْعَثُوْنَ ۔ ۲۶/۸۳-۸۷

"اے میرے ربّ! مجھے کمال علم عطا فرما اور مجھے نیکوں کے ساتھ شامل کر اور
آئندہ آنے والی نسلوں میں میرا ذکرِ خیر باقی رکھ۔ میرا شمار نعمت کے باغ کے وارثوں
میں کر دے اور میرے باپ (چچا) کو بخش دے کہ وہ گمراہوں میں سے تھے۔
مجھے ذلیل نہ کر اور محزون نہ کر اس دن، کہ جس دن لوگ اٹھائے
جائیں گے۔

افادات

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کی لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ آنے والوں
میں ذکرِ خیر، کی دُعا کی قبول ہوئی۔
چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا تذکرہ کرتے ہوئے
فرمایا:۔

وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۱۹/۵۰
(ہم نے ان تینوں کے ذکرِ جمیل کو بلند درجے کا کر دیا۔)

۲۔ لا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ کا ایمان دوبارہ جی اُٹھنے پر
حق الیقین کی حد تک تھا۔

۳۔ مغفرت ابی سے مراد چچا کی بخشش ہے اور آپ بخشش کی دُعا مانگتے رہے تا آنکہ
اللہ تعالیٰ نے منع نہ کر دیا۔

(۶) رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ج

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم - ۶۰/۵

اے ہمارے رب! ہم تجھ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کے جانا ہے۔

اے ہمارے ربّ پروردگار! ہم کو کافروں کے (ظلم) کا تختۂ مشق نہ بنا اور اے ہمارے پالنے والے ہمارے گناہ معاف کر، بے شک تو زبردست اور حکمت والا ہے۔

حضرت لوطؑ کی دعائیں

۱۔ آپ شہر صدوم کے پیغمبر اور حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر تھے۔ جس قوم میں آپ بھیجے گئے تھے وہ قوم خلاف وضع فطری عمل کے مرتکب تھی۔ آپ نے انہیں اس بُری عادت سے باز رہنے کی تلقین کی جب وہ لوگ باز نہ آئے تو ان پر عذاب نازل ہوا۔

یہ امر لائق تاسف ہے کہ اس فعل شنیعہ کا نام بعض لوگوں نے لواطت رکھ چھوڑا ہے۔ دیانت اور اخلاق کا تقاضا ہے اس فعل کو مقدس پیغمبر سے نسبت نہیں دینی چاہیے کہ جو عمر بھر اس کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ انگریزی میں اس کے لیے " (Sodomy) " کسی قدر درست لفظ ہے کہ جس میں اسے صدوم سے منسوب کیا گیا ہے۔

۲۔ مقاماتِ ادعیہ ۲۶/۱۶۹ ، ۲۹/۳۰

۳۔ مقاصد

- عمل قوم کی سزا اور عذاب سے اپنی اور اپنے اہل کی نجات
- قوم مفسد کے خلاف نصرت ربانی

۴۔ دعائیں

- (۱) رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَھْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ

اے میرے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے (بادِاش) عمل سے نجات دینا۔

۲۔ حضرت لوطؑ نے قوم کو ہدایت کے لیے بلایا۔ تو انہوں نے کہا اگر تم سچے ہو تو پھر ہمیں عذاب الٰہی میں مبتلا کر دو۔ اس پر آپ نے یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْن

بارالٰہا! تو مفسد لوگوں کے خلاف میری مدد کر۔

یعنی ان کے خلاف عذاب الٰہی کے نازل ہونے کی جو میں نے خبر دی ہے تو اسے سچا ثابت کر۔

حضرت یوسفؑ کی دعائیں

۱۔ حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ اللہ تعالیٰ کے ایک سچے نبی تھے۔ باپ کو ان سے بہت محبت تھی۔ مگر جہاں محبت ہوتی ہے وہاں حاسد و رقیب بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یوسفؑ کے باقی بھائی اس سے جلنے لگے اور اسے لے جاکر ایک کنویں میں ڈال دیا۔ کنویں سے ایک قافلے والوں نے نکالا اور مصر میں جاکر بیچ دیا۔ وہاں امراۃ العزیز ان پر فریفتہ ہو گئی۔ مگر آپ نے اپنی پاک دامنی پر دھبہ نہ آنے دیا۔ جب دیکھا بظاہر رہ کر عزت و ناموس محفوظ نہیں تو زنداں کی در و دیوار کو پسند کیا۔ قید سے آزاد ہوتے تو آزادی کے ساتھ ہی مصر کی حکومت بھی میسر آئی۔ آپؑ نے اپنے عہد میں ملک کے اقتصادی نظام کی اصلاح کی اور اسے اس قدر مضبوط بنیادوں پر قائم کیا کہ بعد میں قحط سالی ہوتی تو مصر کے پاس وافر مقدار ذخیرہ موجود تھا۔ جس سے گرد و نواح کے ممالک کے لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

حضرت یوسفؑ کے وطن کنعان میں قحط پڑ گیا۔ چنانچہ اس کے بھائی غلہ لینے کے لیے آئے تو آپؑ نے انہیں فراخ دلی کے ساتھ عطا کیا اور بعد میں ظاہر بھی کر دیا کہ میں تمہارا بھائی ہوں وہ لرزہ براندام تھے کہ نجانے کیا سزا تجویز ہو گی۔ مگر آپ نے انہیں لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دیا۔

۲۔ مقاماتِ ادعیہ :۔ ۱۲/۳۳ ، ۱۲/۱۰۱

۳ مقاصد :۔

- تحفظ عصمت کی خاطر زندان قبول کرنا۔
- صالحین کی رفاقت و ملاقات
- اسلام (تسلیم و رضا) پر موت

۴۔ دعائیں :۔ جب امراۃ العزیز زلیخا کے ساتھ اس کی سہلیاں بھی حضرت یوسفؑ

پر شیدا ہوگئیں اور عزت کا بچانا مشکل ہوگیا تو حضرت یوسفؑ نے یہ دُعا کی۔

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ج

وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ۱۲/۳۳

اے میرے رَبّ! قید مجھے اس سے زیادہ پیاری ہے۔ جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے مکر کو نہیں پھیرے گا۔ تو میں ان کی طرف جُھک جاؤں گا اور جاہلوں سے ہو جاؤں گا۔

افادہ ۱:- قرآن پاک میں اس کے بعد اس دُعا کی قبولیت کی خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کو قبول فرمایا اور اس سے عورتوں کے مکر کو پھیر دیا بے شک وہ دعاؤں کا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲- جب حضرت یوسفؑ کے بھائی ماں باپ کو لے کر مصر پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور لبوں پر یہ دُعا تھی۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْکِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ

تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ج فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قف اَنْتَ وَلِیّٖ

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ج تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۱۲/۱۰۱

اے میرے پالنے والے تو نے مجھے ملک عطا فرمایا ہے اور باتوں کی حقیقت (تعبیر خواب وغیرہ) سمجھائی ہے۔ تو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا والی ہے۔ مجھ کو حالتِ اسلام (تسلیم و رضا) پر وفات دینا اور صالحین سے ملا دینا۔

افادہ:- مندرجہ بالا دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے

ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ ج وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ

اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْکُرُوْنَ ۝

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ حالانکہ تو ان کے پاس نہ تھا۔ جب انہوں نے اپنی بات پر اتفاق کیا اور فریب کرنے لگے۔

اس آیت سے مفسرین نے واقعہ یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کا فریب مراد لیا ہے مگر بعض کے خیال میں اس کے بین السطور میں قریش مکہ کی دار الندوہ والی سازش کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ واللہُ اعلم بالصواب

اس طرح سے یہ آیت پیش گوئی کرتی ہے کہ آنحضرتؐ بھی اسی طرح حاکم اور ملک کے مالک ہوں گے کہ جس طرح حضرت یوسفؑ ہوتے تھے۔ نیز مکہ والے اس طرح شرمندہ و خجل ہوں گے کہ جس طرح برادران یوسف ہوئے تھے۔

اتنا تو تاریخ بھی بتاتی ہے کہ سورۂ یوسفؑ واقعہ ہجرت کے قریب نازل ہوئی اور دیگر امور کی تطبیق بھی ممکن ہے۔ کیونکہ

۱۔ حضرت یوسف کے خلاف ایک سازش ہوئی اور اسی طرح آنحضرتؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔

۲۔ حضرت یوسفؑ سازش کے باوجود کسی دوسرے مقام پر پہنچ گئے اور اسی طرح آنحضرتؐ بھی سازش کے باوجود رات کو مدینہ ہجرت کر گئے۔

۳۔ حضرت یوسفؑ کو کنویں میں کچھ روز رہنا پڑا تو آنحضرتؐ بھی کچھ روز غار میں رہے۔

۴۔ حضرت یوسف جہاں پہنچے وہاں کے حاکم بنے۔ اسی طرح آنحضرتؐ بھی جہاں ہجرت کر کے گئے وہاں آپ کو حکومت ملی۔

۵۔ حضرت یوسف سے قحط سالی میں اس کے دشمن بھائیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح ابوسفیان نے قحط سالی میں آپؐ سے مدد چاہی۔

۶۔ انجام کار جس طرح برادرانِ یوسفؑ شرمندہ ہوئے اور حضرت یوسف نے انہیں لَاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کیا۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے بعد فرمایا۔

"آج میں بھی تمہیں اپنے بھائی یوسف کی اقتدا میں کہتا ہوں لَاتثریب علیکم الیوم آج تم سے کوئی باز پرس نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اللہ تمہیں معاف فرمائے۔

حضرت شعیبؑ کی دُعا

۱۔ آپ اصحاب الایکہ اور مدین کی طرف بھیجے گئے تھے۔ اپنے تبلیغی مشن میں انہوں نے توحید کے علاوہ اہلِ وطن کو ناپ تول میں دیانت اختیار کرنے کی پرزور تلقین کی۔

قوم نے انہیں دھمکی دی اور کہا کہ اگر تمہارے قبیلے کا لحاظ نہ ہوتا تو تجھ کو سنگسار کر دیا جاتا۔ قوم نے مزید یہ بھی کہا کہ ہم تمہیں اور مومنوں کو بستی سے نکال دیں گے یا اپنی ملت میں واپس لے آئیں گے۔

اس پر حضرت شعیبؑ نے فرمایا تم لوگ عذاب الٰہی کا انتظار کرو اور میں نصرت ربّانی کا منتظر ہوں اور پھر مندرجہ ذیل دعا مانگی۔

چنانچہ ان پر عذاب آیا۔ اس سے صرف اہلِ ایمان کو نجات ملی۔

۲۔ مقام دُعا:- ۸۹/۷

۳۔ مقاصد دُعا:-

- توکل علی اللہ
- معرکۂ حق و باطل میں حق کی فتح

دعا : وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۚ عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ ۸۹/۷

ہمارے ربّ کا علم ہر شے میں سمایا ہوا ہے۔ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب تو ہماری اور ہماری قوم کے درمیان حق کو فتح دے۔ اور تو (بالتحقیق) خیر الفاتحین ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی دعائیں

۱۔ حضرت موسیٰؑ (Moses) ایک اولوالعزم پیغمبر تھے انہوں نے بنی اسرائیل کے بکھرے ہوئے شیرازے کو اکٹھا کیا اور انہیں مذلت سے اُٹھا کر بامِ عروج پر لا کھڑا کیا۔ آنحضرتؐ کو قرآن پاک نے مثیل موسیٰؑ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

• واقعی آنحضرتؐ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کو ایک سے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ موسیٰؑ فرعون کے مقابلے میں گئے تھے تو آنحضرتؐ کے سامنے سرکشانِ عرب تھے، جو فرعون سے کہیں کم نہ تھے۔ نیز اُمت، کتاب، ہجرت، شریعت، جہاد بالسیف، باطل کی شکست اور حق کی بالآخر فتح وغیرہ امور دونوں مقدس پیغمبروں میں مشترک تھے۔

۲۔ مقاماتِ ادعیہ:۔ ۷/۱۵۱، ۷/۱۵۵،۱۵۶، ۲۰/۲۵،۳۰، ۲۸/۱۶، ۲۸/۲۱، ۲۸/۲۴

۳۔ مقاصدِ ادعیہ:۔

- ظالموں سے نجات
- دین و دنیا کی بھلائی
- شرح صدر
- معیت ہارونؑ
- مہم میں آسانی
- اہلیتِ خطاب
- تاثیرِ کلام
- اعترافِ لغزش
- اپنی اور اپنے بھائی کی مغفرت
- جوارِ رحمت
- قوم کی خواہشِ رویت پر عذر خواہی۔

۴ دعائیں

۱۔ حضرت موسیٰؑ ایک بار شہر میں جا رہے تھے کہ دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا، ان میں سے ایک اسرائیلی تھا اور دوسرا قبطی تھا۔ اسرائیلی نے آپؑ سے مدد کے لیے فریاد کی۔ آپؑ نے قبطی کو مکہ مارا اور وہ اپنے شیطانی عمل کے نتیجہ میں مر گیا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے اس مقبول بندے نے اپنے لیے مغفرت کی مندرجہ ذیل دعا مانگی۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ ۲۸/۱۶

(اے میرے رب میں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے۔ تو میری بخشش (اور محافظت کر)

۲۔ قبطی کی موت کا حادثہ حضرت موسیٰؑ کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ اُمراء نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کے منصوبے سوچنے شروع کر دیے۔ ایک خیر خواہ نے آکر آپ کو سب حال بتا دیا اور ہجرت کا پُر خلوص مشورہ دیا۔ پس آپ شہر سے خفیہ طور پر نکل کھڑے ہوئے اور یہ دعا مانگی۔

رَبِّ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۲۸/۲۱

پالنے والے مجھے جور پیشہ لوگوں سے محفوظ رکھنا

۳۔ ہجرت کر کے جب حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو وہاں کنوئیں پر لوگوں کا ہجوم دیکھا کہ جو جانوروں کو پانی پلا رہا تھا اور ان سے ہٹ کر عورتوں کو کھڑا دیکھا کہ جو بکریاں روکے کھڑی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نے پوچھا آپ کیوں کھڑی ہیں؟

"انہوں نے کہا۔ ہمارا باپ (حضرت شعیبؑ) بوڑھا ہے۔ اس لیے ہم اپنے جانوروں کو پانی پلانے آئی ہیں۔ مگر جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا نہیں لیتے اور ہنکا کر نہیں لے جاتے ہم رکی کھڑی ہیں۔"

یہ سن کر حضرت موسیٰؑ نے ان کے واسطے پانی نکالا اور پھر سائے میں مڑ کر یہ دعا مانگی۔

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

اے میرے پروردگار! میں اس بھلائی کا جو تو میری طرف اتارے محتاج ہوں۔

افادہ:- دو مخدراتِ عصمت کو دبکے کھڑے دیکھ کر حضرت موسیٰؑ میں جذبۂ ترحّم پیدا ہوا۔ مرد کے لیے لازم بھی ہے کہ وہ جنسِ ضعیف کی جائز ممکن مدد سے احتراز نہ

کرے۔ وہ دونوں حضرت شعیبؑ کی بیٹیاں تھیں اِن کی شرافت و حیا سے حضرت موسیٰؑ بہت متاثر ہوئے اور خود انہیں گھر بسانے کی ضرورت بھی تھی لہٰذا اچھے سے رشتے کی دُعا بھی مانگ لی۔

۴۔ حضرت موسیٰؑ کو جب نبوت سے سرفراز کیا گیا اور انہیں فرعون کی طرف بھیجا گیا تو انہوں نے بارِ رسالت کی گرانباری کا احساس کیا اور یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۝
وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا
مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِكْهُ
فِیْٓ اَمْرِیْ۔ ۲۰/۲۵-۳۲

میرے ربّ میرا سینہ کھول دے اور میرا کام (امرِ تبلیغ) آسان کردے میری زبان سے گرہ کھول دے کہ وہ میری بات سمجھیں، میرے اہل سے یعنی میرے بھائی ہارونؑ کو میرا بوجھ اٹھانے والا بنا۔ اس سے میری کمر مضبوط کر اور اس کو بھی میرے کام میں شریک کردے۔

۵۔ حضرت موسیٰؑ جب تورات لینے کوہِ طور پر گئے اور ان کی عدم موجودگی میں حضرت ہارونؑ خلیفہ تھے تو ایک ساحر۔ سامری نے دھاتوں سے ایک عجیب بچھڑا تیار کیا کہ جب اس میں ہوا داخل ہوتی تھی تو وہ آواز دیتا تھا۔

قوموں کی نفسیات بھی عجیب ہے نہ ماننا ہو تو ربّ العزت کو بھی نہیں مانتے اور ماننے پر آجاتیں تو پھر پتھر کی مورتیوں، بچھڑوں اور فرعونوں کو خُدا بنالیتے ہیں۔

چنانچہ بنی اسرائیل نے اس بچھڑے کی پرستش شروع کردی۔ حضرت ہارونؑ نے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی مگر ان کی ایک نہ سنی گئی۔

حضرت موسیٰؑ نے واپس آکر حضرت ہارونؑ سے جواب طلبی کی، جواب طلبی کا مقصد بالواسطہ قوم کو تنبیہ کرنا تھا۔ حضرت ہارونؑ نے اپنا معقول اعتذار پیش کیا تو حضرت موسیٰؑ نے خُدا کے حضور میں یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ
اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۷/۱۵۱

پالنے والے! میری اور میرے بھائی (ہارونؑ) کی بخشش کر اور ہم دونوں

کو اپنی رحمت میں داخل کر۔ تحقیق تو رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

۶۔ جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی پر نادم ہوئے اور مغفرت کے طالب ہوئے تو حضرت موسیٰؑ نے ستر آدمی منتخب کیے اور انہیں لے کر کوہ طُور پر پہنچے اور وہاں زلزلے نے آلیا تو حضرت موسیٰؑ نے یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ ○ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ

۷/۱۵۵

اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو پہلے سے ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتا۔ کیا (اب) ہم کو اس فعل کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا اور کچھ نہیں۔ بس تیرا امتحان ہی تو ہے، پس تو جس کو چاہے ہدایت کرے یا نہ کرے ہمارا تُو ہی والی ہے۔ پس ہم کو بخش اور ہم پر رحم کر اور تو ہی بہتر بخشنے والا ہے۔ ہمارے واسطے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے۔ تحقیق ہم تیری طرف جُھک گئے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کی دعائیں

۱ حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ نہ صرف اپنی دانائی کے لیے مشہور ہیں بلکہ اپنی سطوتِ شاہی کا سکّہ بھی چار دانگ عالم میں بٹھا چکے ہیں آپ اقتدارِ اعلیٰ کے اس عہدے پر تھے کہ سرکش سے سرکش مخلوق آپ کے اشارۂ ابرو پر ناچتی تھی۔ مگر باایں ہمہ دست بدعا رہتے تھے، بلکہ یہ اقتدار اور سیادت بھی دعاؤں کا نتیجہ تھے۔

۲۔ **مقاماتِ ادعیہ:۔** ۲۷/۱۹ ، ۳۸/۳۵

۳۔ **مقاصدِ ادعیہ:۔**

- بخشش اور مغفرت
- نیک بندوں میں شمار
- مثالی اقتدار
- توفیق شکرِ نعمت
- ایسے عمل کی توفیق کہ جو خوشنودیٔ خُدا کا موجب ہو۔

۴۔ **دعائیں:۔** آپ وادیٔ نمل میں پہنچے تو یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ
وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ ۲۷/۱۹

اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر احسان کیے ہیں (اور مجھے توفیق دے) کہ میں اچھے عمل کروں جس سے تو خوش ہو جائے اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شریک کر۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو ایک آزمائش میں ڈالا جو غالباً آپؑ کے ہاں نالائق بیٹے رحبعام کا پیدا ہونا تھا۔

اس پر آپؑ نے یہ دُعا مانگی۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ
مِّنْۢ بَعْدِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
۳۸/۳۵

پالنے والے! میری مغفرت کر اور مجھے ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد کسی کو نہ پہنچے، بیشک تو بہت دینے والا ہے۔

حضرت ایوبؑ کی دُعا

۱۔ آپؑ کی مثال تاریخ انبیاء میں مثالی صابر کی ہے۔ آپ بہت خوشحال اور فارغ البال تھے لیکن اس کے باوجود خدا تعالیٰ کو ہر وقت یاد کرتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان سے ازراہ فخر کہا۔ دیکھو! میرا بندہ کتنا فرمانبردار ہے۔

اس پر شیطان نے تعریض کی کہ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کیلیے عیش و آرام کی زندگی بسر ہے اگر حالات بدل جائیں تو یادِ الہٰی بھی نذر نسیان ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ حضرت ایوبؑ کا مال و متاع سب جاتا رہا۔ بیماریوں اور مصیبتوں نے آن گھیرا۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ پاک بدن میں کیڑے پڑ گئے اور آپؑ کو شہر چھوڑ کر ویرانے میں بسر کرنا پڑا۔ مگر یادِ خدا سے قطعاً غافل نہ ہوتے۔

شیطان نے بہت کوشش کی کہ آپؑ یا تو غیر اللہ کو پکار دیں یا رحمتِ الہٰی سے مایوس ہو جائیں مگر بے سُود، عبد صالح کی زبان حمد الہٰی کے ترانے گاتی رہی۔ قطعاً مایوس نہ ہوتے اور آخر شفایابی کے لیے دُعا مانگی تو اپنے رب سے اور یہ دُعا قبول ہوئی۔

۲۔ مقام دُعا :۔ $\frac{21}{83}$

۳۔ مقصد :۔ مقصد وحید، مصائب سے نجات تھی۔

دُعا :۔ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ

بار الٰہا! مجھ پر مصیبت آپڑی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

افادہ :۔ اللہ تعالیٰ نے قصۂ ایوبؑ کو عبادت گذاروں کے لیے ذکری (نصیحت) قرار دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو مصائب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مصائب ترقی مدارج کے ضامن ہیں نیز ہر حالت میں خُدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور خُدا کی یاد میں اگر وقتی طور پر نقصان نظر آتے تو بددل نہ ہوں۔

حضرت یونسؑ کی دُعا

۱۔ حضرت یُونس بن متیؑ کا لقب ذوالنون (مچھلی والا) مشہور رہے۔ وہ اپنی قوم کو کافی عرصہ تک تبلیغ کرتے رہے لیکن کوئی ایمان نہ لایا۔ قوم پر عذاب الٰہی دیکھ کر ان پر غضبناک ہو کر چلے گئے۔ جہاز میں جا رہے تھے ایک وہیل مچھلی کا لقمہ بن گئے۔ خُدا تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انہیں محفوظ رکھا۔ تہ در تہ اندھیروں میں آپ دُعا مانگتے رہے اور آپؑ کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ مچھلی نے آپ کو ساحل پر اُگل دیا اور کچھ عرصے بعد پھر اپنے فریضۂ تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔

۲۔ مقام دُعا:۔ $\frac{۲۱}{۸۷}$

۳۔ دُعا:۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔

تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، تحقیق میں زیادتی پر تھا۔

۴۔ افادہ:۔ یہ آیت آیت کریمہ کہلاتی ہے اور بڑی عظمت و جلال والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کے بعد اس کی قبولیت پر مہر ثبت کی ہے اور فرمایا ہے ہم نے اُسے غم سے نجات دی ہے اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔

اصحابِ طالوتؑ کی دُعا

۱۔ حضرتِ طالوتؑ ایک اسرائیلی بادشاہ تھے جنہیں صحفِ قدیم میں ساول SAUL
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپ شجاعت اور علم کی وجہ سے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے انہیں حکومت بخشی انہیں جالُوت کا مقابلہ کرنا تھا، چنانچہ مقابلہ سے پہلے حضرت طالُوتؑ نے اپنے ساتھیوں کو آزمانا ضروری سمجھا کہ کس قدر لوگ شدائد جنگ پر صبر کر سکتے ہیں۔ جو آزمائش میں پورے اُترے اُن کی تعداد ۳۱۳ تھی۔

حضرت طالوتؑ مقابلے پر نکلے تو ان کے ساتھیوں نے یہ دُعا مانگی۔

۲۔ مقامِ دُعا: $\frac{۲}{۲۵۰}$

۳۔ مقاصد

- (جنگ کی تلخی اور شدائد پر) صبر
- ثبات و استقلال
- کفار کے خلاف نصرت

دُعا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کا فیضان کر۔ ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے گروہ پر ہمیں فتح عطا کر۔

افادہ یہ دُعا اور قصہ طالوتؑ عہد رسالتِ مآب میں غزوۂ بدر سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اور دعا بیان کر کے اصحاب سرورِ کائنات کو راہِ عمل دکھائی ہے اور ان میں جرأت اور جذبۂ طاعت

مضاعف کیا۔
قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ آزمائش کے بعد جالوت کے لشکرِ جرار کو دیکھ کر بعض اصحاب طالوتؑ کہنے لگے تھے۔ آج ہم میں جالوت کے مقابلے کی طاقت نہیں، مگر ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں۔ انہوں نے کہا، بہت سی قلیل جماعتیں کثیر گروہوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے غالب آتی رہتی ہیں۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (ملاحظہ ہو ۲/۲۴۹)

یہ رُوح پرور الفاظ یقیناً اصحاب محمدؐ کا حوصلہ بڑھاتے ہوں گے اور کامیابی کا یقین دلاتے ہوں گے۔ غزوہ بدر میں بقول طبری، ثعالبی اور کسائی اصحاب محمدؐ کی تعداد اصحاب طالوتؑ کی مانند ۳۱۳ تھی۔ یہ نہتے تین سو تیرہ جانباز، باطل کے لشکرِ جرار کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔

پرستانِ حق کی یہ مختصر سی جماعت جب میدان میں نکلی ہو گی۔ تو کس قدر رُوح پرور منظر ہو گا۔ ایک طرف اصحابِ رسولؐ کے لبوں پر دعائیں ہوں گی دوسری طرف حضرتؐ خود دست بدعا ہوں گے۔ فضا میں یہ صدا ارتعاش پیدا کر رہی ہو گی۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ عَھْدَکَ وَوَعْدَکَ۔ اَللّٰھُمَّ
اِنْ تَھْلِکْ ھٰذِہِ العِصَابَۃُ الیَوْمَ فَلَا تُعْبَدُ فِی الاَرْضِ۔

یا اللہ! میں تجھے تیرا عہد اور وعدہ دوبارہ یاد دلاتا ہوں!
یا الٰہا! اگر آج یہ مختصر سی جماعت مٹ گئی تو رُوئے زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔

دعائیں رنگ لائیں اور وہ مختصر سی کمزور و بے سر و سامان جماعت غالب ہی۔

اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الغَالِبُوْنَ۔

غزوہ بدر، عروج اسلام کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے اور جن خوش نصیب صحابہؓ نے اس میں حصہ لیا وہ بجا طور پر خصوصی عزت و تکریم کے مستحق ہیں۔

رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ

حضرت زکریاؑ کی دعائیں

۱۔ حضرت زکریاؑ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں انبیاء کے فریق میں سے تھے اور آپ کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھیں۔ جس کا نام الیشبع تھا۔

دونوں شوہر بیوی راست باز اور احکام الٰہی پر کاربند بزرگ تھے۔ الیشبع بانجھ تھیں اور ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ نیز وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ (ملاحظہ ہو انجیل لوقا $\frac{1}{5-7}$)

حضرت زکریاؑ اولاد نرینہ کے بہت آرزومند تھے۔ چنانچہ انہوں نے بارگاہِ احدیت میں دعا کی اور وہ دعا قبول ہوئی۔ انجیل مقدس نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ فرشتے نے کہا کہ اے زکریاؑ! تجھے مبارک ہو تیری دعا سن لی گئی ہے اور تیرے لیے تیری بیوی الیشبع سے بیٹا ہو گا۔ تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی و خرمی ہو گی اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش سے بہت خوش ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو لوقا $\frac{1}{15}$)

قرآن پاک نے نام یحییٰ دیا ہے اور اسے کلمۃ اللہ (حضرت عیسیٰ) کا تصدیق کرنے والا سید سردار، جتی ستی اور صالح نبی قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو $\frac{3}{39}$)

قرآن مجید میں زکریاؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ یہ بزرگ نیکیوں کی طرف دوڑا کرتے تھے اور ہمیں لالچ، طمع اور خوف سے پکارتے رہتے تھے اور ہمارے سامنے پوری عاجزی کرنے والے تھے۔ $\frac{21}{90}$

۲۔ مقامات ادعیہ :- $\frac{3}{37}$، $\frac{19}{44}$، $\frac{21}{89}$

۳۔ مقصد :- حضرت زکریاؑ کی تمام تر دعاؤں کا مقصدِ وحید اولادِ نرینہ کا حصول تھا۔ آپؑ کا اس قدر اس غرض پر زور دینا خالی از حکمت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حیاتی تسلسل (Vital Continuity) مشیتِ الٰہی اور تخلیق کے عظیم پروگرام میں سے ہے۔

اس میں تحفظ خود اور اشاعتِ خود کے دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں اور نفی حیات کا مسلک اور رہبانیت نوعِ انسان کے لیے کسی طرح مفید نہیں۔

کونسا ایسا انسان ہے جو اولاد بالخصوص نرینہ کی طلب و تمنا سے تہی ہو۔

اولاد نیک ہو تو بجا طور پر حیاتِ جاوداں کا باعث ہے۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ موت کے بعد انسان کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر تین عمل باقی رہتے ہیں۔

۱۔ صدقہ جاریہ ۲۔ نفع پہنچانے والا علم اور ۳۔ نیک اولاد جو دُعا کرتی رہے۔

انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت زکریاؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے بڑھاپے میں اولاد کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ حضرت زکریاؑ کی تو تمام تر دعائیں ہی اولاد نرینہ کے لیے تھیں۔ انبیاء علیہم السلام دعوتِ حق کے سلسلے کو جاری رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اولاد نرینہ اس کا ایک ذریعہ تھی۔

ان دعاؤں میں وراثت سے مراد علم و دین کی وارثت ہے نہ کہ مال و متاع کی وراثت کیونکہ یہ بزرگ اس سفلی جذبے سے کافی بلند تھے۔

حضرت زکریاؑ کی دعاؤں کے نتیجے میں حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ انجیلی ادب میں آپ کی ذات یُوحنا رسول کے نام سے مشہور ہے اور آپ مسیح ناصری کی آمد سے پہلے ان کے لیے راہیں تیار کر رہے تھے۔ حضرت یُوحناؑ نے نہ صرف حضرت مسیحؑ کی نبوت کی تصدیق کی بلکہ آنحضرتؐ (وہ رسُولؐ) کی پیش گوئی بھی فرما دی تھی۔

عہدِ مسیحؑ میں ہی حضرت یُوحناؑ بھی حق پرستوں کی رسم قدیم کے مطابق دار و رسن سے دوچار ہوئے ایک رقاصہ نے آپ کے سر مبارک کی فرمائش کی اور وقت کے ظالم حاکم نے اس فاحشہ کی فرمائش پُوری کرتے ہوئے انہیں خاک و خون میں لوٹا دیا۔

سلامٌ علیہ یوم وُلِدَ ویَوْمَ یموتُ ویَوْمَ یُبعَثُ حیاً $\frac{19}{15}$

۴ دعائیں

۱۔ حضرت مریمؑ ایسی صالح لڑکی کہ جو ہیکل میں حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی کو دیکھ کر حضرت زکریاؑ کے جی میں یہ تمنا کروٹیں لینے لگی کہ ان کے ہاں بھی کچھ نیک اولاد ہوتی۔ چنانچہ محراب میں مُنہ

سے بے اختیار دُعا نکلی۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ج

اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۳/۳۸

پالنے والے! مجھے تو اپنے پاس سے پاک اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔

۲۔ بڑھاپے میں اولاد کی دُعا مانگنا لوگوں کے لیے مضحکہ خیز بن سکتا تھا۔ لہذا چپکے سے دُعا کی۔

رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ

شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْ م بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ٥ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ

مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۱۹/۴-۶

پالنے والے! میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور بڑھاپے سے سر سفید ہو گیا ہے۔ اور اے میرے رب! میں کبھی (عمر بھر) تجھ سے دعا مانگ کر محروم نہیں رہا۔

اور (اب)، بے شک میں اپنے رشتہ داروں سے اندیشہ رکھتا ہوں، اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ پس تو اپنے پاس سے ہی ایک وارث عطا کر۔ جو میرا اور یعقوبؑ کے خاندان کا بھی وارث ہو۔ اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنا۔

۳۔ ایک موقعہ پر مندرجہ ذیل دعا مانگی۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۲۱/۸۹

اے میرے رب! مجھے اکیلا مت چھوڑ۔ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔

حضرت عیسٰیؑ کی دُعا

۱۔ حضرت عیسیٰؑ حضرت اسحاقؑ کے سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے اور ان کے بعد بنو اسماعیل میں سے حضرت ابراہیمؑ کی آرزوؤں کے ثمر، آنحضرتؐ (وُہ نبی) مبعوث ہونے والے تھے۔ اس طرح نبوت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف تبدیلی کے ساتھ ساتھ تحویلِ قبلہ کی ضرورت بھی واضح تھی۔ رُوحانی دُنیا میں یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا اور اس انقلاب کی پیش گوئی کرنے کے لیے واقعی کلمۃ الحق کی زبان چاہیئے تھی۔

کلمۃ اللہ اپنے متعلق وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (۱۹/۳۳)

قرآن پاک نے حضرت عیسیٰؑ کی صرف ایک دُعا بیان کی ہے۔ جس کا مقصد آسمانی خوانِ نعمت کی طلب تھی۔ اس دُعا کی اہمیت کے سبب اس سورہ کا نام بھی سورہ المائدہ رکھا گیا ہے۔

۲ مقام دُعا: ۵/۱۱۴

۳ مقاصد:
- نزول مائدہ
- اوّلین و آخرین کے لیے یہ واقعہ عید قرار پائے۔
- فراخیٔ رزق

۴ دعا: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنْکَ ج وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ

اے خداوند! اے ہمارے رب! تو ہم پر آسمان سے ایک خوان اُتار کہ جو ہمارے پہلے اور پچھلوں کے واسطے عید ہو جائے اور تیری طرف سے نشان ہو، رزق با فراغت ملے۔ بے شک تو رزق دینے والوں میں سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

افادہ اس دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی ہے کہ میں تم پر وہ خوان اتارنے والا ہوں۔ مگر جو اس کے بعد تم میں سے کفر (کفرانِ نعمت) کرے گا۔ اسے ایسا سخت عذاب دوں گا کہ پہلے کسی کو نہ دیا گیا ہوگا۔ $(\frac{5}{115})$

مزید قرآن اس آسمانی خوان کے بارے میں خاموش ہے کہ آیا وہ خوان اترا تھا یا عذاب کی وعید سُن کر حضرت عیسیٰؑ کی اُمت کے لوگوں نے یہ درخواست واپس لے لی تھی۔

یاد رہے کہ دعائے مائدہ حضرت عیسیٰؑ نے خود نہیں مانگی تھی مگر اپنے اصحاب کے تقاضے پر مانگی تھی۔

حدیث شریف میں بروایت حضرت عمار بن یاسرؓ آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ مائدہ (خوان) اتارا گیا تھا اور اس میں روٹی اور گوشت تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی حکم تھا کہ افرادِ امت اس میں خیانت نہ کریں۔ (ترمذی)

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ انہیں خیانت اور ذخیرہ کرنے سے روکا گیا تھا۔ مگر اُنہوں نے یہ دونوں فعل کیے چنانچہ سزا کے طور پر وہ مسخ کر دیے گئے۔

مفسر بیضاوی کے خیال کے مطابق یہ ایک بڑی مچھلی کا خوان تھا۔

انجیل کے مطابق مائدہ کا نزول ہوا تھا جب کہ حضرت عیسیٰؑ نے دریائے طبریاس کے پاس دُعا کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پانچ روٹیوں اور مچھلیوں سے پانچ ہزار آدمیوں کا شکم سیر کر دیا تھا۔ بعض دیگر مسیحی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے یہ دُعا اپنی آخری یادگار دعوت کے موقع پر کی تھی کہ جسے عشائے ربانی (The Last Supper) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ایمان لانے والے ساحروں کی دعائیں

۱۔ فرعون نے ساحروں کو بلا کر حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر پیغمبر خدا نے ساحروں کی ایک نہ چلنے دی اور عصائے موسیٰؑ ان سب کے طلسمات کو نگل گیا تو ساحر ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد ان میں اس قدر انقلاب آگیا اور اس طرح قلب ماہیت ہو گئی کہ وہ ساحر جو تھوڑی دیر پہلے انعام اور معاوضے کے لیے پیشگی فیصلہ کر کے دنیاداروں کا ثبوت دے رہے تھے اب فرعون کی دھمکیوں کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔

فرعون نے دھمکی دی کہ تمہیں صلیب پر چڑھا دیا جائے گا تو جواب دیا۔

فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ $\frac{20}{72}$

تو جو کچھ کرنا چاہے کر گزر۔ تیرا حکم بس دنیوی زندگی میں ہی تو چلتا ہے۔

اور پھر صبر کی دعا مانگی۔

۲۔ **مقاماتِ دعا:** $\frac{7}{126}$ ، $\frac{26}{51}$

۳۔ **دعائیں:** ۱۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ $\frac{7}{126}$

پالنے والے ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں توفیق دے کہ ہم دنیا سے رخصت ہوں تو تیرے فرمانبردار ہوں۔ یعنی ہمیں موت بھی تسلیم و رضا کی دیجئے۔

۲۔ جب صلیب کی دھمکی دی گئی تو انہوں نے اعلان کیا کہ صلیب ؟ کوئی مضائقہ نہیں تن بدن حاضر ہیں آخر ہم نے اپنے رب ہی کی طرف تو لوٹنا ہے۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ

تحقیق ہم چاہتے ہیں اور ہمیں امید بھی ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اور ہم سب سے پہلے ایمان لاتے ہیں۔

زوجۂ فرعون کی دُعا

۱۔ حضرت آسیہؑ فرعون کے گھر میں تھیں، مگر انہوں نے اپنا دامنِ ایمان، شرک کی آلودگیوں سے ملوث نہیں ہونے دیا۔ اس کنول کے پھول کی طرح۔ کہ جو کیچڑ اور گندگی میں اُگتا ہے مگر اپنی انفرادیت باقی رکھتا ہے۔

طبقۂ نساء کو اگرچہ نبوت کے اعزاز کا سزاوار نہیں سمجھا گیا۔ مگر یہ اعزاز کچھ کم نہیں کہ انبیاء نے ان کی گود میں پرورش پائی ہے اور تربیتِ اولین کی عزت انہیں کے حصہ میں آئی ہے۔ عورت محض عورت نہیں ہے بلکہ ماں بھی ہے اور ماں جس کے قدموں میں بقول پیغمبرِ اسلامؐ جنت ہے۔

۲ مقامِ دُعا:۔ $\frac{۶۶}{۱۱}$

۳۔ مقاصد:۔
- ○ ظالموں سے حفاظت
- ○ فرعون اور اس کے اعمال سے نجات
- ○ جوارِ رحمت اور جنت میں مکان

۴۔ دُعا:۔ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

اے میرے رَبّ! تو میرے لیے اپنے پاس ایک گھر بہشت میں بنا دیجئے۔ اور مجھ کو فرعون اور اس کے عمل سے بچائیو۔ نیز ظالموں سے میری حفاظت کیجیو!

اصحابِ کہف کی دُعا

یُورپ میں اصحاب کہف (The Seven Sleepers of Ephesus) کے نام سے مشہور ہیں چند نوجوان جو تعداد میں طاق اور توحید کے پرستار تھے، ان پر کفر زار ملک کی زمین جب تنگ ہو گئی تو وہ اللہ کے سہارے سے نکل کھڑے ہوتے اور ایک غار میں جا پناہ لی۔

وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک لمبے عرصہ کے لیے سلادیا، جب بیدار ہوتے تو حالات بدل چکے تھے اب باطل سرنگوں تھا اور حق کو غلبہ میسر تھا۔ جب وہ لوگ غار میں پناہ گزیں ہوئے تو یہ دُعا مانگی۔

۲۔ **مقامِ دُعا :-** ۱۸/۱۰

۳۔ **مقاصد :-** رحمتِ یزداں رشد و ہدایت

۴ **دُعا :-** رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

اے ہمارے رَبّ! ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا کر اور ہمارے کام میں نیک بختی کا سامان تیار کر۔

افادہ :- یہ دُعا اور واقعہ اصحاب کہف کی سورت کا نزول مکہ مکرمہ کے آخری دور میں ہوا۔ اس میں توحید پرستوں کے لیے نامساعد حالات میں جبکہ طاغوتی طاقتیں برسرِاقتدار ہوں جو طرزِ عمل اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی اِن حالات میں ہجرت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ یہ سورۃ آنحضرتؐ کے غار میں پناہ لینے کی پیشگوئی کا بھی کام دیتی ہے۔ نیز پیروانِ اسلام کو دورِ مکہ میں رحمت اور نیک بختی کی دُعا مانگنے کی بالواسطہ تلقین ہے جس کا نتیجہ مدینہ میں باحسن وجوہ پُورا ہوا۔

ربّانی مجاہدین کی دُعا

۱۔ دُنیا میں ہمیشہ جانبازوں کی ایک جماعت موجود رہی ہے جس کا کام انبیاء علیہم السلام کا ساتھ دینا تھا۔ یہ لوگ کفن سر سے باندھ کر حمایتِ حق میں اُٹھتے ہیں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرانا، ان عاشقانِ باصفا کا ادنیٰ سا شیوہ ہے ؎

باآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند ۔۔۔ سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

قرآن مجید نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ انبیاء کرام کے ہمراہ بہت سے ربانی لوگ جہاد کرتے رہے ہیں پس اللہ کی راہ میں جو کچھ ان پر بیتی، اس سے وُہ دل برداشتہ نہیں ہوتے۔ باطل کے مقابلہ میں انہوں نے کبھی بھی اپنی مسکنت اور کمزوری کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ یہ دُعا رہی "پالنے والے! ہم جہاد کا حق شاید صحیح طور پر ادا نہ کر سکے ہوں۔ تو ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دے ہمیں ثابت قدم رکھ اور حق کا بول بالا کر۔

۲۔ **مقامِ دعا:** ۳/۱۴۷

۳۔ **مقاصد:** ○ مغفرتِ معاصی ○ کفار کے مقابلہ میں نصرتِ ربانی ○ استقامت و استقلال ○ زیادتی کی معافی

۴۔ **دُعا:** رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ۔

"ہمارے پالنے والے! ہماری لغزشوں کو معاف کر دے اور ہم سے اپنے امر (جہاد اور حمایتِ حق) میں جو زیادتی ہو جائے اس سے بھی درگذر فرما، ہمارے قدموں کو (جادۂ حق پر اور میدانِ جنگ میں) ثبات اور استقلال بخش اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔"

افادہ: اس دُعا کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انہیں دنیا کا ثواب (فتح و نصرت) دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی عطا کی۔ اللہ تعالیٰ محسنین کو دوست رکھتا ہے۔ ۳/۱۴۸

ربانی مجاہدین کے ذکر سے اللہ تعالیٰ آنحضرت صلعم کے بعض محاربات بالخصوص غزوہ احد کا تذکرہ کیا ہے۔ ان حالات کے بیان کرنے سے قدرت کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی کوتاہیوں کا احساس کریں اور میدانِ جہاد میں ثابت قدمی اختیار کریں۔

مستضعفین کی دعائیں

۱۔ ہر تحریک و مذہب ابتداء میں کمزور لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں ناقابلِ تسخیر عزائم کی بدولت وہ لوگ بامِ عروج تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی تحریک اور مذہب کا بھی بول بالا کرتے ہیں۔ دعوتِ حق کی عالمگیر تحریک اکثر ایسے ادوار سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ مگر انجام کار ہمیشہ فتح و نصرت نے آگے بڑھ کر مردانِ حق کے قدم چومے ہیں۔

فراعنہ مصر کے عہد میں بنی اسرائیل مصائب و ابتلاء کا شکار تھے۔ مگر حضرت موسیٰؑ نے اپنے حیات پرور پیغام سے انہیں عزت و تمکنت کے بلند مقام پہ لا کھڑا کیا۔

اسی طرح آنحضرتؐ جو مثیل موسیٰؑ تھے ان کی دعوت تبلیغ کا دور، عہد موسوی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ابتداء میں آنحضرتؐ کے ساتھی بھی مقہور و مغلوب تھے مگر بالآخر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں غلبہ بخشا۔

یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ ظالم انجام کار اپنے کیفرِ کردار کو پہنچتے ہیں اور مظلوم ان کی سیادت و جائداد کے وارث بنتے ہیں۔

فرعون اور موسیٰؑ کی مثال سے صحابہ کرامؓ کو بشارت دی گئی ہے کہ تم جو اب کمزور اور مظلوم ہو، وہ وقت دور نہیں کہ امام اور وارث زمین بنو گے۔

قرآن پاک نے اپنی ایک مکی سورت میں جبکہ فتح و حکمرانی کا تصور تک امید موہوم تھا۔ واضح الفاظ میں اعلان فرمایا۔

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ
وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَ نُمَكِّنَ
لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَ نُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ
مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۲۸/۶-۵

"(اور) ہم ارادہ کرتے ہیں کہ جو زمین پر کمزور سمجھے گئے ہیں، ان پر احسان کریں، ان کو امام اور وارث بنائیں اور انہیں تمکنت فی الارض عطا کریں۔ نیز فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہ کچھ دکھا دیں، جس سے وہ ڈرا کرتے تھے۔

اصحاب موسیٰؑ اور اصحاب محمدؐ کی کامیابی و کامرانی ان دعاؤں کی بدولت بھی تھی کہ جو مانگا کرتے تھے۔

۲۔ مقاماتِ ادعیہ :- ۱۰/۸۶،۸۵ ، ۴/۷۵

۳۔ مقاصد :- (ا) اصحاب موسیٰؑ

- اللہ تعالیٰ پر بھروسہ
- ظالموں کے لیے وہ فتنہ نہ بنیں
- دارالکفر سے نجات

(ب) اصحاب محمدؐ

- ظالم بستی سے بحفاظت اخراج
- نصرتِ ربّانی

۴۔ کمزور اصحاب موسیٰؑ کی دعا

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ج رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰/۸۵-۸۶) مکیہ

ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے ربّ تو ہم کو ظالم قوم کے واسطے موجب امتحان نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت کے ساتھ ظالموں سے نجات دے۔

افادہ

ظالموں کے لیے فتنہ سے مراد یہ ہے کہ ہمیں کمزور اور مجبور سمجھ کر کافروں کو یہ گمان نہ ہو جائے کہ وہ حق پر ہیں۔

۵۔ مجبور اصحاب محمدؐ کی دُعا۔

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ج وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۴/۷۵

اے ہمارے ربّ! ہمیں اس بستی (مکہ) سے نکال کہ یہاں کے لوگ جفا پیشہ ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی والی مقرر فرما اور اپنی جانب سے ہمارے واسطے کوئی مددگار بھیج۔

نیک اولاد کی دعائیں

۱۔ والدین کے لیے مغفرت کی دُعا، اعتراف تربیت کی بہترین مثال ہے۔ والدین اپنے جبلی تقاضوں کو پُورا کرتے ہوتے۔ جس قدر اپنے بچّوں کی خاطر ایثار وقُربانی اور شفقت و محبت سے کام لیتے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ والدین خواہ کتنے پریشان حال کیوں نہ ہوں، بچّے کے لیے آغوش مادر ہمیشہ گہوارۂ رحمت ہوتی ہے۔ لہٰذا سعادت مند بیٹے ہمیشہ والدین کے احسانات کا بدلہ ادا کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ والدین کی بخشش کی اہمیت دعاؤں سے واضح کی گئی ہے۔

ترکِ تعلقات بے مروتی اور نفرت باہم جو اختلافِ مذہب کا قدرتی نتیجہ سمجھے جاتے ہیں وہ بھی والدین کے معاملے میں حارج نہیں۔

انبیاء علیہم السلام اپنے والدین کے لیے عموماً مغفرت کی دُعا مانگتے رہے ہیں خواہ انہوں نے دعوتِ حق کا ساتھ دیا ہو یا نہ۔

۲۔ **مقاماتِ ادعیہ** :۔ ۱۷/۲۴ ، ۴۶/۱۵

۳۔ **مقاصد**

○ حق تربیت کا اعتراف اور والدین کے لیے دعائے رحمت
○ شکرانِ نعمت کی توفیق
○ رضائے الٰہی کے کاموں کی ہمت۔ ○ صالح اولاد

۴۔ **دعائیں** : ۱۔ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۱۷/۲۴

پالنے والے! جیسے میرے والدین نے میرے بچپن میں میری (شفقت کے ساتھ) پرورش کی ہے۔ تو بھی ان دونوں پر رحم فرما۔

۲۔ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ ۴۶/۱۵

اے میرے پالنے والے! تو مجھے توفیق دے کہ میں تیری نعمت کا شکر ادا کروں کہ جو تو نے مہربانیاں مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کی ہیں اور توفیق دے اچھے عمل کروں۔ جن سے تو خوش ہو جاتے اور میری اولاد کو نیک بنا۔ میں تیری طرف جُھک گیا ہوں اور فرمانبردار ہوں۔

علمائے نصاریٰ کی دُعائیں

۱۔ اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے اور اس نے دوسرے مذاہب کی صداقت کا اعتراف کرنے سے قطعاً گریز نہیں کیا۔ دوسرے بانیانِ مذاہب کے معاملے میں آنحضرتؐ نے بڑا اچھا رویہ اختیار کیا ہے ان کی دینی خدمت اور فضائل کا خیرہ چشمی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ دراصل سب الہامی مذہب ایک مشترک مقصد کی خاطر قائم ہوتے تھے اور وہ مقصد انسانوں میں للہیت پیدا کرنا تھا اختلاف طبائع اور اقتضاء عصر کے تحت ان کے طریق کار میں کسی قدر اختلاف ضروری تھا۔

عِبَارَاتُنَا شَتّٰی وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ

وَكُلٌّ اِلٰی ذَاكَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ!

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی عداوت میں بلحاظ قوم لوگوں میں سے سخت تر یہود اور عام مشرک ہیں اور محبت میں مسلمانوں کے قریب تر وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے عالم فاضل لوگ ہیں اور ایسے درویش ہیں کہ جو خبطِ برتری اور غرور زہد کا شکار نہیں (بلکہ دل کے حلیم ہیں) اور جب وہ قرآن کو سنتے ہیں کہ رسول عربی پر نازل ہوا ہے تو آنکھیں معرفتِ حق میں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ان کے لبوں پر یہ دُعا آ جاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو $\frac{5}{82}$)

نیز ان کے لیے اس دُعا اور اعترافِ حق کی جزا میں جنت کا وعدہ ہے کیونکہ یہ پہلے بھی اہل کتاب تھے اور بعد میں آنحضرت صلعم پر ایمان لائے۔

۲۔ مقام دُعا :۔ $\frac{5}{83\text{–}84}$

۳۔ مقاصد :۔

○ حق کی شہادت دینے میں ہمارا نام ہو۔

○ صالحین کی جماعت میں داخلہ

۴۔ دُعا :۔

رَبَّنَا اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ○ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ

الصّٰلِحِيْنَ ۔ ۸۴،۸۳/۵

اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ۔ پس ہمارا نام بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لیجئے ۔ اور ہم کو کیا ہوا؟ کہ ہم اللہ پر اور ہمارے پاس جو حق آیا ہے اس پر ایمان نہ لائیں اور ہم آرزو کرتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں کے ساتھ داخل (جنت) کرے ۔

افادہ :- اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ قرآن پاک کی صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں اور انہیں درست تسلیم کرتے ہیں چنانچہ اس کی بڑی مثال اصحمہ نجاشی کا واقعہ ہے ۔ جس نے قرآن پاک کا وہ حصہ سُناکر جو حضرت عیسیٰؑ کے حالات پر مشتمل ہے تو اس پر رقت طاری ہو گئی ۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے اور بالآخر اس نے اعلان کیا کہ قرآن پاک نے واقعہ عیسیٰؑ اور فضائل جو کچھ بیان کیے ہیں ۔ وہ حرف بحرف درست ہیں ۔

ابن شہاب الزہری کے قول کے مطابق یہ دُعا اور ماقبل کی آیات نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں ۔ (سیرۃ ابنِ ہشام)

نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا ۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس حُسنِ سلوک کا بدلہ کس قدر دیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے دُور دراز تک کے علاقے فتح کیے مگر آج تک حبشہ کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا وہاں کا حکمران آج بھی عیسائی ہے ۔

دانشوروں کی دعائیں

۱۔ حقائق اشیاء کی دریافت، انسانی دانش کا بنیادی تقاضا ہے تجسّس کی جبلّت (Instinct of Curiousity) اس کے لیے یقیناً مہمیز کا کام دیتی ہے۔ شاہکار فطرت (Work of God) کا مطالعہ اس کے مقصدِ تخلیق، افادیت، خالق اکبر کی محیرّ العقول قدرت اور حکمت کے سربستہ رازوں کو عیاں کرتا ہے اور یہ امر عرفانِ حق کی طرف بھی بخوبی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ علمائے فطرت، کائنات ارض وسما پر غور کرنے کے بعد بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں۔

"خدایا تو نے یہ سارا نظام بے کار نہیں بنایا۔"

عظیم سائنس دان سر آئزک نیوٹن رقمطراز ہیں کہ کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلاباتِ مکان وزمان کے جو ترتیب و تناسب ہے، وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول ہے اور صاحب علم و اختیار ہے۔

دُنیا میں جس قدر سائنس داں گذرے ہیں وہ اکثر و بیشتر ایک برتر ہستی کے قائل رہے ہیں۔ بعض نے اُسے دہر کہا اور بعض نے عقل کل۔ درحقیقت عقل، وجدان اور شعور سب خالق کائنات اور مُدبر ارض و سماوات کے وجود پر قوی دلائل رکھتے ہیں۔

خُدا کا تصوّر ایک آفاقی حقیقت ہے اور سائنس اپنے محدود ذرائع علم کے ساتھ اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتی۔

سائنس نوعِ انسانی کے لیے ایک نعمت کا درجہ رکھتی ہے اس لیے ہمیں کچھ نہ کچھ لمحات فکریہ اس پر صرف کرنے چاہئیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہی سائنسی ایجادات انسانی ہلاکت کا باعث بھی تو ہیں۔ ہمارے سامنے ہیروشیما اور ناگاساکی کی عبرتناک اور رُوح فرسا مثالیں موجود ہیں۔ جوہری توانائی (Atomic Energy) جو اپنے اندر بے پناہ افادیت رکھتی ہے اس کا غلط استعمال، انسانی آبادی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا موجب بھی بن سکتا ہے اور غلط استعمال جسے اسلام نے ظلم کا نام دیا ہے۔ انسان کو جہنم کی آتشِ سوزاں کا مستحق بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ

حق پرست دانشور، ترقی کے اس تاریک پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے اور ان کے لبوں پر ہمیشہ "فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" کے دعائیہ الفاظ رہتے ہیں۔

دینِ فطرت، سائنس کے افادی اور تعمیری رجحانات کی تائید اور حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر اس میں اس سلبی پہلوؤں اور تخریبی کارستانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

آج راکٹوں کے ذریعہ انسان چاند تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہے اور وہ اس محوِ خرام ہے لیکن وہ نسلی تعصبات، رنگ کے امتیازات اور علاقائی تنگنائیوں سے بلند نہیں ہو سکا۔ زمین پر امن کے ساتھ رہنا ابھی تک اسے نہیں آسکا۔ جوہری ہتھیاروں کی جنگ جس کے خوف سے یہ زمین لرزاں و ترساں ہے۔ کہیں چاند بھی اس ہلاکت آفریں ہتھیاروں کی زد میں نہ آجائے۔ یقیناً حق شناس سائنس دانوں کے لیے یہ امر موجبِ تشویش ہوگا۔

۲۔ **مقاماتِ ادعیہ :۔** ۳/۸، ۹، ۳/۱۹۱، ۱۹۴

۳۔ **مقاصد :**

- ہدایت کے بعد کج قلبی سے حفاظت۔
- رحمتِ یزداں۔
- بخشش عصیاں۔
- ابرار کے ساتھ وفات۔
- تسخیرِ کائنات کے بعد تخریب اور جہنم سے بچاؤ۔
- رسولوں کی معرفت جو وعدے ہوتے ہیں۔ وہ پورے ہوں۔
- روزِ محشر حزن و ملال سے نجات۔

۴۔ **دعائیں :۔** ۱۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ ۳/۸، ۹

اے ہمارے ربّ! تو ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد کج مت کیجیو اور اپنی جناب سے رحمت عطا کیجیو۔ تحقیق تو بہت عطا کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! تو لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کرنے والا ہے۔ جس میں کوئی شک نہیں، تحقیق اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تحقیق آسمان اور زمین کی تخلیق اور اختلاف لیل و نہار میں اربابِ دانش کے لیے آیات و بصائر ہیں اور اربابِ دانش وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور تخلیقِ کائنات ارض و سما میں تدبر و تفکر کرتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا اعتراف و اعلان کرتے ہیں اور مندرجہ ذیل دُعا مانگتے ہیں (القرآن ۳/۱۹۱)

کتاب اللہ نے فکر کائنات اور ذکرِ حق کو ایک ساتھ بیان کیا ہے۔ واقعی بقول دانائے راز؛

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر　　فکر را کامل ندیدم جز بذکر

دُعا　رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ o
رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ط وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ o
رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ o رَبَّنَا
وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ
الْمِيْعَادَ - (۳/۱۹۱-۱۹۴)

اے ہمارے رب! تُو نے یہ سب کچھ باطل (خالی از حکمت) پیدا نہیں کیا۔ پس ہم کو آگ سے بچا۔

اے ہمارے رب! تُو نے جسے آگ میں داخل کیا۔ پس تحقیق اسے رُسوا کیا۔ اور ظالموں کے واسطے کوئی مددگار نہیں۔

اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سُنا جو ایمان کے واسطے پکارتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لاتے ہیں۔ بارالہا! ہمارے گناہ معاف کر بخش دے۔ ہماری بدیاں ہم سے دُور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ موت دے۔

اے ہمارے پالنے والے! جو کچھ تُو نے اپنے رسولوں کی معرفت جو ہم سے وعدہ کیا ہے وُہ ہمیں دے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا۔ تحقیق تو وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵/۲۸)

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے بس علماء ہی ڈرتے ہیں جو ڈرنے کا حق ہے۔

اہل ایمان اور نیک بندوں کی دعائیں

۱۔ مقاماتِ ادعیہ :۔ ۱/۵ ، ۲/۲۰۱ ، ۲/۲۸۵،۲۸۶ ، ۳/۱۶ ، ۲۳/۱۰۹
۲۵/۶۵،۶۶ ، ۲۵/۷۴ ، ۵۹/۱۰ ، ۶۶/۸

۲۔ مقاصدِ ادعیہ :۔

- سابق الایمانوں کی بخشش
- عذاب جہنم سے نجات
- صراطِ مستقیم کی ہدایت
- تفریق بین الرسل سے پرہیز
- فرائض کا بار طاقت کے مطابق ہو
- حق کی شہادت
- ازواج واولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہو
- روزِ محشر تکمیل نور
- بخشش اور رحم
- غلطی اور بھول چوک پر مواخذہ نہ ہو
- دُنیا و آخرت کی بھلائی
- ہدایت ربانی پر ایمان
- سابق الایمانوں کے خلاف کوئی کدورت نہ رہے۔
- امم سابقہ کا بوجھ نہ ہو
- صلحاء میں شمار
- پرہیزگاروں کی امامت
- کفار کے خلاف نفرت

۳۔ دعائیں :۔

بارالٰہا! ہمیں سیدھے راہ کی ہدایت کر، یعنی ان (برگزیدہ لوگوں) کے راستے کی جن پر تُونے انعام کیا ہے نہ ان لوگوں کے راستے کی کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ کہ گمراہ ہوئے۔

۴۔ افادہ :۔ انعام یافتہ لوگ قرآن مجید کی اپنی تفسیر کے مطابق انبیاء، صدیقین

شہدا، اور صالحین ہیں۔ (ملاحظہ ہو ۴/۶۹)

۲- رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا
عَذَابَ النَّارِ ۲/۲۰۱

اے ہمارے ربّ! تو ہمیں دُنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی، اور آگ کے عذاب سے بچا۔

افادہ - آنحضرتؐ نے مندرجہ بالا دعا کے مانگنے کی بہت تلقین کی ہے۔ کیونکہ جامعیت میں کوئی دُعا اس کا مقابلہ نہیں سکتی۔

اس دُعا کی تمہید میں ارشاد قدرت ہوتا ہے کہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرو۔ جس طرح کہ تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو۔ ۲/۲۰۰

درحقیقت اس میں اس موقعہ پر دورِ جاہلیت کی عادتِ مفاخرہ کی تعدیل (Sublimation) ہے۔ عرب اسلام سے پہلے حج کے موقعہ پر اپنے آباؤ اجداد کی بڑائی بیان کرتے تھے۔ اسلام نے حکم دیا کہ تم خدا تعالیٰ کا اسی طرح ذکر کرو۔ جس طرح اپنے اباؤ اجداد کا ذکر کرتے ہو۔ نیز اُسے اسی طرح یاد کیا کرو ——— جس طرح بچہ اپنے باپ کو خاص کر دُکھ درد میں یاد کرتا ہے۔

۳- سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ہ غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ہ لَا
یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ ط
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا
کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَۃَ
لَنَا بِہٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقف وَاغْفِرْ لَنَا وقف وَارْحَمْنَا وقف اَنْتَ مَوْلٰنَا
فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۲/۲۸۵-۲۸۶

ہم نے سُنا اور اطاعت کی، اے ہمارے ربّ! فقط تیری بخشش اور محافظت چاہیئے۔ بس تیری ہی طرف بازگشت ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ نیکی کا فائدہ بھی اسی کو ہوگا۔ اور برائی کی زد بھی اسی پر پڑے گی۔ اے ہمارے ربّ تو ہماری گرفت نہ کر۔ اگر ہم بھول گئے یا خطا کر بیٹھے۔ اے ہمارے پالنے والے! تو ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا۔

بار الہٰا! ہم سے وُہ بارِ فرائض نہ اُٹھوائیو کہ جس کے اُٹھانے کی ہم میں سکت نہیں۔
ہم کو معاف کر دیجیئو اور ہماری محافظت و بخشش کیجیئو، ہم پر ا بنا رحم کیجیئو۔ بس
تو ہی ہمارا مولا ہے، پس کفار کے خلاف ہماری نصرت کیجیئو۔

افادہ:۔ یہ ان مومنوں کی دُعا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ اس کی کتابوں اور
اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ تفریق بین الرسل کے قائل نہیں تفریق
بین الرسل سے مراد یہ ہے کہ ہم بعض انبیاءؑ کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ حالانکہ
دین اسلام درحقیقت سب انبیاءؑ کرام کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے اور ہر پیغمبرؑ
نے اپنے طور پر اپنا ضروری اور منصبی فرض سرانجام دیا ہے، اس لیے تمام حضرات
ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں۔

قرآن پاک نے بعض پیغمبروں کا تذکرہ بھی کیا ہے مگر سب کا نہیں اور اس امر کا اس نے اعلان
بھی کر دیا ہے۔

یہ آیات دُعا ایک اندازے کے مطابق ہجرت سے ایک سال قبل نازل ہوئی تھیں۔
اس وقت حق و باطل باہم شدت کے ساتھ ستیزہ کار تھے۔ فرزندانِ توحید پر ظلم کے پہاڑ توڑے
جا رہے تھے۔ ہم بلاکشان اسلام کے حالات پڑھتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر ان
دعاؤں میں کہیں انتقام کی خواہش نہیں۔ لب ہیں کہ آشنائے شکایت نہیں، زبان پر حرف تو بہ ہے
لفظ استغفار ہے مگر کہیں بھی یاس و قنوط کی پرچھائیں نہیں۔

۴ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۶)
اے ہمارے ربّ! تحقیق ہم ایمان لائے پس تو ہمارے واسطے ہمارے گناہ
بخش دے اور ہمیں عذاب جہنم سے بچا۔

افادہ:۔ قرآن پاک نے مندرجہ بالا دعائے مغفرت کو پچھلی رات کے وقت پڑھنے
کی تلقین کی ہے کیونکہ اس دُعا کے بعد المستغفرین بالاسحار کے الفاظ موجود ہیں۔ (۳/۱۷)

۵۔ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۲۳/۱۰۹)
پالنے والے! ہم ایمان لائے ہیں، تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ بے شک
تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے۔

۶۔ مندرجہ ذیل دُعا ان بندگان خدا کی ہے کہ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔

اور جب انہیں جاہلوں سے مخاطبہ ہو جاتے تو کہہ دیتے ہیں کہ سلام (سلامتی) ہو جن کے پہلو رات کو بھی خواب گاہوں میں آشنائے آرام نہیں ہوتے۔ دلوں کی طرح وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھکے ہوتے ہیں۔ کبھی رکوع و سجود کرتے ہیں اور کبھی قیام میں ہوتے ہیں اور ان کے لبوں پر یہ دعا ہوتی ہے۔

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ ۲۵/۶۵

بارالٰہا! تو ہم سے جہنم کا عذاب دُور رکھ کہ اس کا عذاب بڑی مصیبت ہے۔

۷۔ مندرجہ ذیل دُعا ان لوگوں کی دُعا ہے کہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغویات پر ان کا گذر ہوتا ہے تو بزرگانہ طریق سے گزر جاتے ہیں اور جن کا یہ حال ہے کہ جب ان کی رب کی آیات کے ساتھ یاددہانی کرائی جاتی ہے ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں پڑ جاتے اور وہ یہ دُعا مانگتے ہیں۔ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۲۵/۷۴

اے ہمارے ربّ! تو ہم کو ایسی بیویاں اور اولاد عطا کر کہ جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں اور ہم کو پرہیزگاروں کے واسطے امام بنا۔

افادہ:۔ مندرجہ بالا دُعا ایک مکّی سورت میں موجود ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان امامت کے منصب کے آرزومند تھے۔

اور اس سلسلہ میں مکّی دور ایک تیاری کا دور تھا۔ آگے چل کر یہ آرزو کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ کتنے مبارک دن تھے اور کتنا اچھا زمانہ تھا۔ کہ جب ہر مسلمان اپنے اندر امامت کی اہلیت پیدا کر چکا تھا۔ اور امامت کا آرزومند تھا۔

صدق من قال خیر القرون قرنی (الحدیث)

مگر آج کا مسلمان افسوس، تقلید مغرب ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے اوپر اجتہاد کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ عصر حاضر کی نظریں ملّتِ بیضا کی طرف لگی ہوئی ہیں، عالم اسلام کو نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔

شاعر اسلام پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا، شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام، دُنیا کی امامت کا

(۸) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا

غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

پالنے والے تو ہمیں بخش اور ہمارے بھائیوں کو بھی کہ جو ہم سے پہلے ایمان لاتے اور ہمارے دلوں میں ان کے واسطے کوئی رنجش نہ رہنے پاتے، کہ جو ایمان لاتے۔ تحقیق تو مہربان اور رحیم ہے۔

افادہ: مندرجہ بالا ان مہاجروں کی دعا ہے کہ جو بعد میں مدینہ آئے اس دُعا میں سبقت ایمانی کے شرف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہمارے لیے ہدایت بھی ہے کہ ہم پہلے مسلمان بھائیوں کے خلاف کسی قسم کا کینہ یا رنجش دل میں نہ رکھیں بلکہ ہمیشہ حسن ظن سے کام لیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔ ماضی کے گڑھے مردے اکھاڑنے سے آخر کیا حاصل ہے؟

۹۔ مندرجہ ذیل دُعا ان اصحاب محمدؐ کی ہے کہ جن کا نور ان کے سامنے اور دائیں بائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۶۶/۸

اے ہمارے حدِ تمام تک پرورش کرنے والے! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش دے بے شک تو جو چاہے اس پر قادر ہے۔

افادہ: اللہ تعالیٰ نے مومنین سے وعدہ فرمایا: میں تمہیں اپنی رحمت کا دوگنا حصہ دوں گا۔ جس کی روشنی میں تم چلو پھرو گے۔

اصحاب محمدؐ کے نفوس قدسیہ، نور و ہدایت کے پیکر تھے۔ جہاں بھی یہ بزرگ گئے وہاں سے ظلمت دُور اور کافور ہوگئی۔ یہ نور دراصل مشکوٰۃ حق یعنی محمدؐ سے مستنیر تھے۔ مومن اور نور کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ایک حدیث (جس کے اسناد اگرچہ محل نظر ہیں) کے مطابق

قرآن نے منافقوں کی روشنی کی مثال بیان کی ہے کہ وقت پر روشنی چھن گئی اور وہ بھٹکتے رہ گئے مومن اس لیے دُعا مانگتے ہیں کہ ان کی روشنی آخری وقت تک باقی رہے اور نور ایمان بجھنے نہ پائے۔

۱۰۔ سواری پر سوار ہوتے وقت کی دُعا۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۝ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔ ۴۳/۱۴،۱۳

پاک ہے وہ ذات کہ جس نے ہمارے لیے اسے مطیع بنا دیا اور ہم اُسے قابو میں لانے والے نہ تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

آنحضرتؐ کی قرآنی دُعائیں

آنحضرتؐ کی دُعاؤں کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیشگوئیوں کا کام دینے میں اعجازی شان رکھتی ہیں۔ یہ شانِ اعجاز صرف دعاؤں پر منحصر نہیں بلکہ آنحضرتؐ کی ذات سراپا اعجاز ہے۔ یُوں تو ہر نبی / (Prophet) کے خصائص میں نبا یعنی پیش گوئی (Prophecy) لازم شئے ہے مگر آنحضرتؐ (The Prophet) میں یہ صفت بدرجہ کمال پائی گئی ہے۔

آنحضرتؐ کی بعثت کے متعلق جو پیش گوئیاں، انبیائے کرام سے وارد ہوئی ہیں اور جس قدر اہتمام اس امر میں کیا گیا ہے، وہ سرکارِ رسالتؐ کی جلالت قدر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

الہٰی ہدایت کے آفاقی پروگرام کی تکمیل پیغمبر آخر الزمانؐ کی ذات سے وابستہ تھی آپؐ سے پہلے انبیاء علیہم السلام، خاص علاقوں میں خاص قوموں کے لیے مبعوث ہوتے رہے تھے مگر چونکہ آنحضرتؐ تمام دنیا بلکہ ساری کائنات کے لیے بھیجے گئے تھے۔ (القرآن ۲۱/۳۹)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر پیغمبر سے اس امر کا وعدہ لے لیا تھا کہ وہ آنحضرت کی نبوت کی تائید کریں گے۔ یعنی پیش گوئی کرتے اور قوم کو تیار کرتے جائیں گے۔ (القرآن ۳/۸)

آنحضرتؐ نے چونکہ قبلۂ آخرین کے شہر مکہ کہ جو دشمنوں کو نیچا دکھانے کی وجہ سے بکہ (گردن توڑنے والا) بھی کہلاتا تھا، میں پیدا ہونا تھا اور اپنی تبلیغ کی مہم آباد دُنیا کے جوفِ زمین سے شروع کرنا تھی۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے اسی مقصد کی خاطر اپنی بیوی ہاجرہؑ اور بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو بیت اللہ کے پاس جا بسایا تھا اور آپ اسی معاملہ میں مامور من اللہ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس خاص پیغمبر کے لیے دُعا بھی کی تھی کہ وہ ان کی نسل (بنو اسماعیلؑ) سے ہو۔ (القرآن ۲/۱۲۹)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُن کے لیے ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سا ایک نبی مبعُوث کروں گا۔ (تورات سفر استثنا ۱۸/۱۸)

اس وعدہ الہٰی کے مصداق حضرت عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو شرائط مثیل موسیٰؑ ہونے

کی ہیں۔ وہ آپ میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ آپؑ بن باپ کے پیدا ہوتے تھے۔ جب کہ حضرت موسیٰؑ کو یہ فضیلت میسر نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کے خدوخال، مسیحی شریعت کی نسبت، شریعت محمدؐ سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے آنحضرتؐ کا تعارف ہمیشہ مثیل موسیٰؑ کی حیثیت سے کرایا ہے۔ (القرآن ۷۳/۱۵)

نیز "ان کے بھائیوں" سے مراد بنو اسماعیل زیادہ قرین یقین ہیں۔

آنحضرتؐ کے مقام ظہور فاران (سفر استثنا) ہجرت (قول ورقہ بن نوفل) حتیٰ کہ فتوحات بالخصوص فتح مکہ کہ جس میں دس ہزار صحابہؓ کو قدوسیوں سے تعبیر کیا گیا ہے (سفر استثنا) وغیرہ امور سے علماء یہود بخوبی آگاہ تھے۔

حضرت سلیمانؑ! اس محمودِ خلائق، پیغمبر کی نعت و ثنا میں رطب اللسان رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرتؐ کا نہ صرف حلیہ مبارک دیا ہے بلکہ نام محمدیم بھی ظاہر کر دیا ہے (غزل الغزلات)

وید مقدس اور زند اوستا ایسی قدیم کتابوں میں بھی اہل نظر کے لیے آنحضرتؐ سے متعلق بہت سی پیش گوئیاں ہیں حضرت یوحناؑ، حضرت عیسیٰؑ کے پیشرو تھے اور ان سے جب یروشلم کے کاہنوں اور لاویوں نے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ کیا مسیحؑ ہو؟

انہوں نے انکار کیا تو پھر پوچھا کیا ایلیاہ (الیاسؑ ہو)؟

اس کا جواب بھی انہوں نے نفی میں دیا تو پھر پوچھا کیا تم "وہ نبی ہو"؟

اُنہوں نے بتایا کہ نہیں میں "وہ نبی" بھی نہیں ہوں۔ (انجیل یوحنا ۱/۱۹-۲۳)

اس مکالمہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے یہود، آنحضرتؐ۔ وہ رسول، کے منتظر تھے۔ اور آنحضرتؐ (وہ نبی) کا تعارف اس قدر ہو چکا تھا کہ اب نام لینے کی چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔ کیونکہ ہر شخص جسے تھوڑی سی بھی دینی بصیرت ہو، وہ بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے بھی واضح الفاظ میں اپنے بعد دوسرے تسلی دینے والے اور ہمیشہ ساتھ رہنے والے۔ (یوحنا ۱۴/۱۵، ۱۶)

سرورِ کائنات (یوحنا ۱۴/۱۲) نبوت کو مکمل کرنے والے، ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ نبوت مکمل نہ ہو جاتی جب کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروؤں کے کامل بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ (ملاحظہ ہو کرنتھیوں ۱۳/۹)

نیز بادشاہوں والی شان و شوکت رکھنے والے پیغمبر (مکاشفات ۱۹/۱۹) کی پیش گوئی کر دی۔

تھی۔ قرآن پاک نے بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت کا نام۔ احمد لے کر خبر دی
تھی۔ ولادت مسیحؑ سے بیشتر بھی آنحضرتؐ کی اس قدر شہرت تھی کہ لوگ آپؐ کے مقام ظہور اور
ہجرت سے بھی آگاہ تھے۔ چنانچہ جب ملوک تبابعہ میں سے ایک بادشاہ نے یثرب (مدینہ) پر
چڑھائی کی تو دو راسخ العلم یہودیوں نے اسے کہا کہ یثرب اور اہل یثرب کو تباہ کرنے کی نہ سوچے
کیونکہ (ابن ہشام کے الفاظ میں) مُہاجر نبیؐ یخرج من هذا الحرم من قریش فی آخر
الزمان تکون دارہ، وقرارہ پس وہ قتل عام سے باز رہا)

عتبیٰ کے قول کے مطابق یہ واقعہ اسلام سے سات سو سال قبل کا ہے (سیرۃ ابن ہشام ۱/۲)

مورخین کا بیان ہے کہ جب دو موسوی عالموں نے جو مدینہ کے تھے، انہوں نے جب بادشاہ
کو یقین دلایا کہ یہ شہر نبی آخر الزمان کی ہجرت گاہ ہے تو اس نے ایک قصیدہ کہا تھا اور اہل
مدینہ کو بطور امانت دے گیا تھا۔ جو ان کے پاس ہی رہا اور بطور میراث کے ایک دوسرے کے
ہاتھ لگتا رہا اور اس کی روایت سند کے ساتھ برابر چلی آتی رہی یہاں تک کہ حضورؐ کی ہجرت
کے وقت اس کے حافظ حضرت ابو ایوب انصاریؓ تھے۔ بلکہ حسن اتفاق سے آنحضرتؐ کا نزول
اجلال بھی انہی کے ہاں ہوا تھا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ شَہِدْتُ علی اَحْمَدَ اَنَّہٗ رَسُوْلٌ مِنَ اللّٰہِ بَارِی النَّسَم
۲۔ فَلَوْ مُدَّ عُمْرِیْ اِلٰی عُمْرِہٖ لَکُنْتُ وَزِیْرًا لَّہٗ وَابْنَ عَمّ
۳۔ وَجَاهَدْتُ بِالسَّیْفِ اَعْدَاءَہٗ وَفَرَّجْتُ عَنْ صَدْرِہٖ کُلَّ غَمّ

میری تہ دل سے گواہی ہے کہ حضرت احمد مجتبیٰ اس خدا کے سچے رسولؐ ہیں کہ جو تمام جانداروں
کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر میں آنحضرتؐ کے زمانہ تک زندہ رہا۔ تو بخدا ان کا ساتھی اور معاون بن
کر رہوں گا اور آپؐ کے دشمنوں سے تلوار کے ساتھ جہاد کروں گا اور کسی کھٹکے اور غم کو آپ کے
پاس تک نہ پھٹکنے دوں گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

آنحضرتؐ کے مقام ظہور سے آگاہ ہو کر اہل کتاب علماء نے سرزمین عرب کی طرف رُخ کیا۔
اسی وجہ سے یہودی بھی صدیوں پہلے مدینے کے قرب و جوار میں آباد ہو گئے۔ حالانکہ یہودیوں
کی یہ ایک قومی خصلت ہے کہ وہ ہمیشہ زرخیز مقامات پر آباد ہونا پسند کرتے ہیں اور غیر آباد علاقے
کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہود یثرب (مدینۃ الرسول)
کے آس پاس آباد ہو گئے تھے جہاں سے اسلام کا عروج وابستہ تھا۔ جب کہ ملک عرب

کا غیر آباد محتاج شہادت نہیں، یہ ایک ویران ریگستان ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کے قرب وجوار کو "وادیٔ غیر ذی ذرع" کا نام دیا ہے (القرآن ۱۵/۳۷)

حالانکہ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو اسی مصلحت کی خاطر مکے کے پاس آباد کیا تھا۔ اس امر کی تائید کہ اہلِ کتاب، پیغمبر آخرالزماں کی خاطر عرب میں آباد ہوتے تھے۔ کئی ایک اہلِ کتاب صحابہؓ کے بیانات سے ہوتی ہے جو کہ مشرف بااسلام ہوتے تھے۔

ابن الہیبان۔ شام کے یہودیوں میں سے تھا کہ وہ وطن چھوڑ کر یثرب آباد ہوگیا تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے یہودیوں کو بلایا اور کہنے لگا، جانتے ہو، میں کیوں سرسبز و شاداب زمین کو چھوڑ کر اس ویران کنگال علاقہ میں آباد ہوا ہوں۔

یہود نے کہا آپ ہی بتادیں تو اچھا ہے۔

اس پر انہوں نے فرمایا میں یہاں صرف اس وجہ سے آیا ہوں کہ نبی آخرالزمان کی صحبت کی سعادت حاصل کرلوں کہ جن کا وقت قریب آچکا ہے۔ (ابن ہشام)

مفسر ابنِ کثیر بھی بیان کرتے ہیں کہ قوم قریظہ کے بڑے سردار جن سے ان کی نسل جاری ہوئی تھی۔ اگلے زمانے میں آکر حجاز میں اسی طمع میں بسے تھے کہ جس نبی آخرالزماں کی پیش گوئی ہماری کتابوں میں ہے وہ چونکہ یہاں پیدا ہونے والے ہیں۔ لہٰذا ہم سب سے پہلے آپؐ کی اتباع کی سعادت سے مسعود ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرتؐ مبعوث ہوتے تو علمائے اہلِ کتاب نے انہیں فوراً پہچان لیا اور حق پسند سعادت مند آپ پر ایمان لے آتے، واقعی اہلِ کتاب آنحضرتؐ کو بخوبی پہچانتے تھے، یہ اور بات ہے کہ اپنی ضد اور کد کی وجہ سے بالخصوص جو یہود کی طبیعت ثانیہ ہے انہیں بالا علان تسلیم کرنے سے گریز کرتے رہے ہوں۔

چنانچہ قرآن پاک نے دعویٰ کیا ہے کہ

علمائے اہلِ کتاب آنحضرتؐ کو اس طرح پہچانتے ہیں کہ جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچان لیتے ہیں لیکن کتمانِ حق سے کام لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ۲/۱۴۶)

قرآن پاک نے اس امر کی بھی تحدّی ۱ (Challenge) کی ہے کہ نبی الامی کا تذکرہ تورات اور انجیل دونوں میں ہے۔ (۷/۱۵۷)

قرآن مجید کی صداقت بھی اہلِ کتاب علماء پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو اس قرآن سے پہلے علم دیا گیا تھا۔ یعنی اہلِ کتاب جب ان پر قرآن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

سُبْحَانَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا (القرآن ۱۷/۱۰۸)

قدیم الایام سے یہود و نصاریٰ کا معیار صداقت پیش گوئی کو رہا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے جو پیش گوئیاں فرمائیں وہ سب حرف بحرف پوری ہو کر رہیں۔ کتاب اللہ پیش گوئیوں سے بھری پڑی ہے اور اس نے جو وعدے کیے ہیں انہیں کوئی نہیں جھٹلا سکا۔

آنحضرت کی دعائیں تمام تر پیش گوئیوں کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ سب واضح طور پر پوری ہوتیں۔ پیش گوئی کا شرف آنحضرتؐ کے مرتبہ جلیل کے سامنے تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اسلام کے تصوّرِ نبوت میں ہر نبی محض خبر دینے والا نہیں بلکہ وہ نبی (بلا ہمزہ) ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ وہ بلند مقام پر کھڑے ہونے والا ہے۔

آنحضرتؐ للہیت (Devotion to God) کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ جہاں عبد اور معبود کے درمیان انتہائی قرب حاصل ہو جاتا ہے اور بقول دانائے راز۔ اقبالؒ

ع عشق حق آخر سراپا حق شود

ایک حدیث قدسی میں ارشادِ قدرت ہوتا ہے کہ میرا بندہ، میری مکمل اطاعت سے آخر کار اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں میری رضا، اس کی رضا کا احترام کرتی ہے اور میں اس کی دُعا کو رد نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی دُعا ہمیشہ مقصدِ خیر کے لیے ہوتی ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود

بندۂ مومن قضائے حق شود اقبالؒ

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فتوح الغیب میں فرماتے ہیں کہ للہیت سے انسان کبریت احمر بن جاتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یدِ قدرت اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ خارق عادات ظاہر ہونے لگتے ہیں اور وہ علوم لدنیہ سے نوازا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ نے تو مکہ میں ہی اپنی زندگی، اپنی موت یعنی سب کچھ مالکِ حقیقی کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر کا اعلان آپ سے کروایا ہے۔ (ملاحظہ ہو قرآن ۶/۱۶۲، ۱۶۳)

اسی للّٰہیت اور سپردگی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے افعال کو اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ آپؐ تیر مارتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اسے اپنی نسبت سے ذکر کرتے ہیں۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (القرآن)

حتیٰ کہ آنحضرت اس وقت تک کوئی بات نہیں کرتے جب کہ اذنِ الٰہی نہ ہو۔

ایک حدیث قدسی اس مقام پر روشنی ڈالتی دکھائی دیتی ہے کہ میرا بندہ میری عبادت کرتے کرتے آخر کار ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے میں اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

چنانچہ آنحضرتؐ کی قبول دعا کی وہ شان تھی کہ آپؐ کی آرزو ابھی دل میں ہوتی کہ قدرت اسے پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیتی تھی۔ کتاب اللہ میں آنحضرتؐ کی تحویل قبلہ کی خواہش کا تذکرہ ہے مگر یہ خواہش ابھی الفاظ کا جامہ پہن کر لبوں پر بھی نہیں تھی کہ قبولیت نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

ارشاداتِ قدرت ہوتا ہے :-

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

قِبْلَةً تَرْضٰهَا (القرآن ۲/۱۴۴)

اے میرے محبوبؐ! ہم تیرے رُخ کا آسمان کی طرف پھیرنا دیکھ رہے ہیں پس ہم ضرور تم کو اس قبلہ کی طرف پھیریں گے جو تیری رضا ہے۔

آنحضرتؐ کی قرآنی دعاؤں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ سب پیش گوئیوں کا درجہ بھی رکھتی ہیں اور یہ پیش گوئیاں سب کی سب حیاتِ رسالتمآبؐ میں ہی پوری ہوئیں۔

یہ دعائیں مکی عہد کی یادگار ہیں اور اعجاز القرآن کا بین ثبوت!

صرف عطاء ملک اور قوم ملت کی دعا مدنی ہے جو کہ غزوہ احزاب سے پہلے نازل ہوئی۔ غزوہ احزاب کفر اور اسلام کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس کے بعد اسلامی اقتدار روز افزوں ترقی کرتا چلا گیا۔ معرکۂ احد کے مایوس کن حالات کے بعد یہ دعا ایک طرف اگر اہل ایمان کے لیے تسلی کا باعث تھی تو دوسری طرف منکرین کے لیے ہدفِ اعتراض، مگر یہ پیش گوئی دوسری پیش گوئیوں کی طرح پوری ہو کر اس حقیقت کو واشگاف کر گئی کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

یہی کیفیت آنحضرتؐ کی باقی دعاؤں کی ہے کہ جو ساری کی ساری قیام مکہ کی ہیں۔

مثلاً باحفاظت ہجرت، یثرب میں پرامن داخلہ اور مکہ فتح کے متعلق ایک دعا رَبِّ اَدْخِلنِی مُدخَل صِدْقٍ الخ ⁸⁰/۱۷ کے ذریعہ سے پہلے ہی پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ اور اسی طرح کفار اور اہلِ اسلام کے درمیان قطعی فیصلے اور فتح کی دعا رَبِّ اَحْکُم بِالحَقِّ ¹¹²/۲۱) بھی عہد رسالت مآبؐ میں بر آئی تھی۔

فتح مکہ کا واقعہ آنحضرتؐ کی زندگی میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کفارِ مکہ کو بھی پہلے سے ہی اس امر کی اطلاع دے دی گئی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی شانِ کریمی ملاحظہ ہو کہ آپؐ دعا مانگتے ہیں کہ جب یہ وعدہ (فتح) پورا ہو تو مجھے ظلم سے باز رکھنا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پیش گوئی پورے اہتمام کے ساتھ پوری ہوئی۔ مکہ فتح ہوا اور خون ناحق کا ایک قطرہ تک ارضِ مقدس پر نہ بہنے پایا۔ بلکہ مکانات اور جائداد کو جو مہاجرین کی اصل ملکیت تھی وہ بھی قابضین کے پاس رہنے دی اور اس طرح فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبلَۃً تَرضٰہَا (ہم تمہیں تمہارے پسندیدہ قبلہ مکہ کی طرف پھیر دیں گے)، کا ایک پہلو جو پیش گوئی کا کام بھی کرتا ہے کہ آپ کعبہ (مکہ مکرمہ) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ وہ پورا ہوا۔

سرکشانِ مکہ جو آنحضرتؐ کی جان کے لاگو رہے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو طرح طرح سے ستایا تھا۔ ترکشِ ظلم کا کوئی تیر ایسا نہیں تھا جو انہوں نے چلایا نہ ہو، اب وہ لوگ آپؐ کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ آپؐ چاہتے تو سب کو قتل کر دیتے کیونکہ وہ واجب القتل بھی تھے اور فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔ آپؐ نے رحم سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔

"آج نہ تم پر الزام رکھتا ہوں اور نہ تم پر اظہارِ خفگی کرتا ہوں۔ بلکہ میری دعا ہے کہ خدا بھی تمہیں معاف فرمائے، بیشک وہ ارحم الراحمین ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

اور اس طرح رَبِّ فَلَا تَجعَلنِی فِی القَومِ الظّٰلِمِینَ کی دعا بھی پوری ہوئی آنحضرتؐ نے بخشش کے لیے جو دعا مانگی ہے اس میں تعمیم (Generality) ہے اور یہ امر آپؐ کے منصب شفاعت پر فائز ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور گنہگاروں کے لیے بہت بڑی تسلی کا کام دیتا ہے، بے شک آپؐ بہت بڑے تسلی دینے والے تھے۔

شفاعت کو قرآن پاک نے مقام محمود سے بھی تعبیر کیا ہے۔

ازدادِ علم کی دعا کا شرفِ قبول محتاجِ تعارف نہیں وہ نبی الامی —— جس نے

کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا اس نے صحرائے عرب میں علم و حکمت کے دریا بہا دیئے۔

از دم سیراب آں اُمی لقب
لالہ رُست از ریگ صحرائے عرب

ایک طرف کلام اللہ کے معارف، دوسری طرف آنحضرتؐ کے جوامع الکلم اور فرمودات کہ جنہیں احادیث کا نام دیا گیا ہے۔

علم و فنون کے کتنے شعبے ایسے ہیں کہ جو سرکارِ رسالتؐ کی وجہ سے عالم وجود میں آتے ہیں اور زندگی کا کون سا ایسا پہلو ہے کہ جس پر آنحضرتؐ نے سیر حاصل معلومات بہم نہ پہنچائی ہوں۔ اس معلم اعظم کے زیرِ تربیت جو اصحاب رہے، وُہ علم و فضل کے مطلع شہرت پر مہر و مہ بن کر چمکے۔ آپ کی تعلیم کے طفیل عرب کے گڈریے علم و فن کے میدان میں سارے جہاں سے سبقت لے گئے اور ساربان جہاں بان بن گئے۔

سائنسی علوم جن پر آج یورپ کو ناز ہے اور یہ ناز بجا بھی ہے، درحقیقت مسلمانوں کے علمی کارناموں کا مرہونِ منت ہے۔ جبکہ یورپ پر جہالت کی تاریکی مسلط تھی، اس وقت غلامانِ محمدؐ، علم و عرفان کی روشن شمعوں کا درجہ رکھتے تھے۔ اور دیارِ اسلام، روشنی کے مینار تھے

افسوس آج ہم جو ہمیشہ آگے رہا کرتے تھے، ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں افسوس صرف اس امر کا نہیں کہ ہم پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ہم میں احساس ندامت بھی تو نہیں رہا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
اور کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا — اقبالؒ

آنحضرتؐ کی دعاؤں کا ایک بڑا مقصد قیام ملک و ملت تھا، ملت کی ہیئت اجتماعیہ حضرت ابراہیمؑ کی انتہائی تمنا تھی۔ اس غرض کے لیے آپؑ نے حضرت اسماعیل کو مرجع خلائق کعبہ کے پاس آباد کر کے ان کے لیے کثرتِ اولاد کی دُعا مانگی تھی اور اللہ نے دُعا کو قبول کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

اسماعیلؑ کے حق میں میں نے تیری دُعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دُوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار ہوں گے اور میں اُسے بڑی قوم بناؤں گا۔ (تورات سفر پیدائش ۱۷/۲۰)

چنانچہ بنو اسماعیلؑ بہت پھلے پھولے اور عرب میں یہ لوگ کافی با اثر سمجھے جاتے تھے آنحضرتؐ اولادِ ابراہیمؑ کے اس بکھرے ہوئے شیرازے کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے اور دینِ کامل کا تقاضا بھی یہی تھا۔

اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔ چنانچہ اس کی تعلیمات تمام شعبہ ہائے زندگی میں برابر رہنمائی کرسکتی ہیں۔ پیغمبر آخر الزماںؐ کی مقدس زندگی اس فلسفہ حیات کی عملی تفسیر تھی کہ جو دینِ حنیف نے پیش کیا تھا۔

سیرت اور حدیث کا لٹریچر اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ آنحضرتؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ اور ریکارڈ کر لیا گیا ہے اور آپ کی سیرت کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو اصحاب الحدیث رحمہم اللہ علیہم سے اوجھل رہ گیا ہو۔ آپؐ نے عبادات و اعمال کے بارے میں نظری اور عملی تعلیم دی۔

مجاہدین کے ساتھ میدان میں نکل کر عسکری تنظیم کے خد و خال واضح کیے۔ مثالی ازدواجی زندگی گذار کر تدبیر منزل اور گھریلو معاملات پر روشنی ڈالی، اصلاحِ معاشرہ اور اخلاق کا بیڑہ اٹھایا تو برائیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا، حالانکہ وہ ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں۔

میدانِ تعلیم و تربیت میں آئے تو لاکھوں انسانوں کو قابلِ رشک معلم بنا دیا۔

مملکت کے رموز و اسرار ہنوز سربستہ تھے، اس سے پہلے وحی آسمانی نے مصلحتاً اس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ صرف حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے عہد میں تدبیرِ سلطنت کے کچھ تجربے ہوتے تھے۔

آخر ارتقائے احوال سے فضا اس قدر ہموار ہو گئی کہ آخری پیغمبرؐ نے محض نظری تعلیم پر اکتفا نہیں کی بلکہ ضروری سمجھا کہ تدبیر مملکت کا عملی نمونہ پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ایسی دعائیں مانگیں جن سے وجودِ امت اور ریاست کے قیام کی آرزو کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ دعائیں درِ اجابت سے جا ٹکرائیں اور عرب میں جہاں صدیوں پہلے بھی کوئی مرکزیت اور حکومت نہ تھی وہاں ایک تھوڑے عرصہ میں ایک جمہوریہ (Republic) قائم ہو گئی آنحضرتؐ اس نوزائیدہ مملکت کے سربراہ قرار پائے۔ شوریٰ یعنی باشعور طبقہ (Intelligentia) کی رائے اور مشورہ تدبیر مملکت کا رہنما اصول ٹھہرا۔ حکومت نیابتِ الٰہی کے اصول پر قائم ہوئی جس میں حکمران کی ذات بھی قانون سے بلند نہ تھی۔ وضعِ قانون کے لیے الہامی کتاب قرآن مجید موجود تھی اور آنحضرتؐ کی ذات پاک شارعِ قانون کی حیثیت رکھتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اونٹ چرانے والے، عرب کے بدو، جہاں گیر و جہاں بان بن گئے، وہ عرب سے اُٹھے اور تمام دُنیا پر چھا گئے۔ یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک فاضل مستشرق مسٹر باسورتھ سمتھ رقم طراز ہیں کہ یہ ایک عجیب اتفاق ہے اور جو تاریخ میں مطلقاً کوئی نظیر نہیں رکھتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تین قسم کے بانی ہوتے۔ قوم، سلطنت، مذہب کے، خود ناخواندہ کہ پڑھنے لکھنے کی کچھ قابلیت نہ رکھتے تھے۔ باوجود اس کے، انہی نے ایک ایسی کتاب پیش کی جو نظم بھی ہے، مجموعۂ قانون بھی ہے۔ عام دُعا کی کتاب بھی ہے اور بائیبل بھی۔

اور اس وقت دُنیا کا چھٹا حصہ اس کو فصاحت و بلاغت، حکمت اور حقیقت کے لحاظ سے معجزہ مانتا ہے، یہ ایک معجزہ ہے۔ جس کا دعویٰ حضرت محمدؐ نے کہا۔ آپؐ نے اس کا نام مستقل معجزہ رکھا اور بے شک یہ ایک معجزہ ہی ہے۔

آنحضرتؐ کی یہ تنظیم صرف علاقائی تنظیم نہ تھی۔ بلکہ اس میں عالمگیری اور آفاقیت تھی۔ اسلام عرب کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ وہ سارے عالم کے لیے تھا۔ اس میں اخوت اور مساوات کا دور دَورہ تھا۔ کالے، گورے، عربی، عجمی میں قطعاً کوئی نسلی امتیاز نہیں تھا۔

یاد رہے اسلام میں وطنیت کا تصور، عام تصور سے بالکل مختلف ہے، یہاں وطن جغرافیائی حدود میں مقید نہیں بلکہ وحدتِ عقیدہ ہی ایک اصل اصول ہے۔ جس پر ملت بیضا کی یہ پرشکوہ عمارت قائم ہے۔ محدود نظریہ وطنیت (Nationalism) سے انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے عظیم مفکر اقبالؒ نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور نوعِ انسان کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس فتنے سے خبردار کیا ہے۔

مقاماتِ ادعیہ: ۳/۲۵،۲۶ ، ۶/۱۶۲-۱۶۴ ، ۱۴/۸۰ ، ۲۰/۱۱۴ ، ۲۱/۱۱۲ ، ۲۳/۹۳-۹۴ ، ۲۳/۱۱۸ ، ۲۳/۹۷-۹۸ ، ۳۹/۴۶

مقاصد:

- طلبِ خیر
- عزت
- للہیت اور تسلیم و رضا
- ازدادِ علم
- لدُنی ملکہ استدلال
- ملتِ اسلامیہ کا احیاء
- ملت کے لیے رزقِ کثیر
- ظالمین سے دُوری
- با حفاظت ہجرت
- پرامن داخلہ (مدینے اور مکے میں)
- نصرت الٰہی اور تائید ربانی
- دشمنانِ حق کے بارے میں حق تعالیٰ نے جو وعدے کیے ہیں وہ حیاتِ رسالت مآب میں پورے ہوں۔
- جب اقتدار نصیب ہو، تو ظلم سے باز رکھنا۔
- ملک اور حکومت عطا ہو۔
- بخشش عام۔

دعائیں

۱۔

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ
الْمُسْلِمِينَ ۔ ۶/۱۶۲-۱۶۳

میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے کہ جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں (رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں) میں سے پہلا مسلم ہوں۔

۲۔

رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا

اے میرے پالنے والے! میرے علم کو زیادہ کر ۲۰/۱۱۴

۳۔

رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ
عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۲۱/۱۱۲

اے رب! انصاف کا فیصلہ کر دے اور ہمارا رب تو بڑا مہربان ہے اس سے مدد مانگی جاتی ہے ان باتوں پر، کہ جو تم بیان کرتے ہو،

۴۔

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَ
اجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا ۱۷/۸۰

پالنے والے! میرا داخلہ خیر و خوبی کے ساتھ ہو اور میرا نکلنا بھی بھلائی سے ہو۔ نیز میرے لیے اپنے پاس سے مددگار بھیجے گا۔

۵ رَبِّ اِمَّا تُرِیَنِّیْ مَا یُوْعَدُوْنَ ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۔ ۲۳/۹۴-۹۳

اے میرے رب! اگر تو مجھے دکھائے وہ امر کہ جس کا وعدہ دیا جا رہا ہے۔ تو میرے ربّ! مجھے ظالموں میں شامل نہ کر۔

افادہ:-

مشرکین منکرینِ حق کے تاخت و تاراج ہونے کا قدرت نے وعدہ کیا ہے تو آنحضرتؐ نے اپنے لیے دعا مانگی ہے کہ اے اللہ! مجھے ظالموں میں شامل نہ کرنا۔

یعنی ۱۔ ان پر قابو پاؤں تو ظلم نہ کرنے پاؤں۔
۲۔ ان پر تو عذاب بھیجے تو مجھے ان کے ساتھ عذاب میں مبتلا نہ کرنا۔

۶

رَبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ۲۳/۱۱۸

بارالٰہا! (ہمارے قصور) معاف کر (اور ہمارے حال پر) رحم فرما۔ اور تو رحم کرنے والوں سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

۷

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۳/۲۷-۲۶

اے اللہ! بادشاہی کے مالک! جسے تو چاہتا ہے۔ سلطنت دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے۔ جسے تو چاہتا ہے، عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کرتا ہے۔ سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے۔ بیشک تو جو چاہے اس پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔

اور جسے تو چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔

افادہ :۔ اس دُعا میں حسنِ طلب قابلِ داد ہے۔

۸۔

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ
وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۲۳/۹۷-۹۸

اے میرے رَب میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطانی خطرات سے اور اے میرے رَب! اس سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ شیطان میرے پاس آئیں۔

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ
وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِىْ مَا كَانُوْا فِيْهِ
يَخْتَلِفُوْنَ ۳۹/۴۶

اے اللہ :۔ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے۔ ہر چھپی اور کھلی بات کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں فیصلہ کرے گا۔ اس بات میں کہ جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔

آنحضرتؐ کی ادعیہ ماثورہ

کتبِ احادیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ اللہ تعالےٰ کے عبدِ خاص اور پیغمبرِ خاص نے اپنے الفاظ میں جو طلب آرزو کی ہے وہ جامعیت، فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہ نبوی دعائیں کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں ہیں۔ الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے اور مطالب ومقاصد بلند وارفع ہیں۔ ان دعاؤں میں عجز ونیاز، توبہ وانابت، تسلیم ورضا اور کارسازِ حقیقی پر اعتماد وتوکل کا بھرپور اظہار ہے اور یہ دعائیں استقامت و عزیمت، بخشش ومغفرت، فتح ونصرت، حفظ وامان، امن وعافیت، توفیقِ عمل وقبولیتِ عمل غرضیکہ دنیا وآخرت کی ہر طرح کی خیر وخوبی کی طلب کو موثر پیرایہ بیان اور پُرخلوص انداز کے ساتھ پیش کرتی ہیں ان دعاؤں کے لفظ لفظ سے عشقِ الٰہی کا آبِ حیات ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ دعائیں رشد وہدایت کا گنج گراں مایہ ہیں اور استجابت اور قبولیت کے اعتبار سے یقیناً سریع التاثیر ہیں۔ چند مسنون دعاؤں کا انتخاب درج ذیل ہے۔

۱۔ سوتے وقت کی دعا۔

حضور نبی کریمؐ جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو داہنی کروٹ پر قبلہ رو ہو کر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْكَ ووَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْكَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْكَ رَغْبَۃً وَرَھْبَۃً اِلَیْكَ لَا مَلْجَاءَ وَ مَنْجَاءَ مِنْكَ اِلَّا اِلَیْكَ اٰمَنْتُ بِکِتَابِكَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَنَبِیِّكَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔

(بخاری ومسلم)

ترجمہ:۔ اے اللہ! مَیں نے اپنے آپ کو تیرے سپرد کر دیا ہے، اپنے چہرے کو تیری طرف متوجہ کر لیا ہے، اپنا سارا معاملہ تیرے حوالہ کر دیا ہے اور اپنی پیٹھ تیرے

سہارے پر لگا دی ہے۔ پس حصولِ ثواب کی آرزو لیے ہوئے اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہوتے میرے لیے تیری ذات اور رحمت کے سوا کوئی جلتے پناہ اور باز پرس سے نجات کی جگہ نہیں ہے۔ میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو تو نے نازل فرمائی ہے اور اس نبی پر بھی ایمان ہے کہ جو تو نے بھیجا ہے۔

فائدہ :- ارشادِ نبویؐ ہے کہ جو شخص یہ دُعا پڑھ کر سوئے اگر وہ اس رات مر جائے تو اس کی وفات فطرتِ اسلام پر ہوگی اور زندہ رہے تو خیر و خوبی اسے ضرور پہنچے گی۔

۲۔ صبح و شام کی دُعا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم روزانہ ان دعائیہ کلمات کو صبح و شام کہتے تھے اور کبھی ناغہ نہ فرماتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ العافیۃَ فی الدُّنیا والاخرۃِ اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ العفوَ والعافیۃَ فی دِینِیْ ودُنیای واَهْلِیْ ومَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عوراتی وَاٰمِنْ روعاتی اَللّٰهُمَّ احفظنی من بین یدیّ ومِنْ خَلْفِیْ وعَنْ یمینی وعن شمالی ومن فوقی واعوذُبكَ بعظمتِكَ مِنْ اَنْ اغتال من تحتی۔

(سنن ابوداؤد)

ترجمہ:-

اے اللہ! میں تجھ سے دُنیا و آخرت کی عافیت چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین و دنیا، مال اور اہل و عیال کی سلامتی اور عفو طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو میرے عیبوں کو ڈھانپ دے اور مجھے ہر طرح کے خوف سے مامون فرما دے۔ اے اللہ! تو میری آگے، پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر سے حفاظت فرما۔ میں تیری عظمت کے ذریعے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کہیں اچانک نیچے سے ہلاک کر دیا جاؤں۔

۳۔ جامع دُعا

حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ رسُول پاکؐ یہ دُعا بالعموم مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اعوذبکَ مِنَ العجز والکسل والجبن والبخل و الھرمِ وعذابِ القبر اَللّٰھُمَّ اتِ نفسی وتقونھا و زکھا انتَ خیرُ مَنْ زکھا اَنْتَ ولیھا و مولٰھا اَللّٰھُمَّ اِنِّی اعوذبکَ مِنْ علمٍ لا ینفع وَ مِنْ قلبٍ لا یخشع وَمِنْ نفسٍ لاَ تشبع وَمِنْ دعوۃ لا یستجاب لھا۔

(صحیح مسلم)

ترجمہ:۔ بارالٰہا! میں تیرے ذریعے عاجزی، کاہلی، بزدلی، کنجوسی، بڑھاپے اور قبر کے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میرے نفس کو پرہیزگاری عطا فرما اور اس کا تزکیہ کردے۔ آپ تزکیہ کرنے والوں میں سے بہترین ذات ہیں تو ہی اس نفس کا مالک اور آقا ہے۔ اے اللہ! میں تیرے ذریعے پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دیتا ہو، ایسے دل سے جو تیرے حضور جھکا نہ ہو ایسے نفس سے جو سیر نہ ہوتا ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو

۴ طلبِ مغفرت کی دُعا۔

حضرت موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ سرکارِ رسالت مآبؐ یہ دُعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اغفرلی خطیئتی وَجَھْلِی وَ اِسرافی فی امری وَمَا اَنْتَ اعلم بہٖ منی اَللّٰھُمَّ اغفرلی جِدّی وھَزلِی وخطائی وعمدی وکل ذالکَ عندی اَللّٰھُمَّ اغفرلی مَا قدمتُ وَمَا اخرتُ وَمَا اسررتُ وَ مَا اعلنتُ وَمَا اَنْتَ اعلم بہٖ مِنّی اَنْتَ المقدم وانتَ المؤخر واَنْتَ علی کل شیءٍ قدیرٌ (بخاری)

ترجمہ:۔ اے اللہ! میری خطا، میری نادانی، معاملات میں میری زیادتی اور ان تمام گناہوں کو جن کا مجھ سے زیادہ تجھے علم ہے، بخش دے اے اللہ! تو میری اس بات کو بخش دے جو میں نے ارادے اور سنجیدگی کے ساتھ کی ہو اور

اس بات کو بھی جو میں نے ہنسی اور دل لگی کے طور پر کی ہو۔ ایسے ہی ایسی تمام باتوں کو جو میں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر کی ہوں اور یہ سب چیزیں مجھ میں موجود ہیں۔ اے اللہ! میرے اگلے پچھلے ظاہر اور پوشیدہ گناہوں کو بخش دے اور ایسے گناہوں کی بھی بخشش کر دے جن کا علم مجھ سے زیادہ تجھ کو ہے۔ تو ہی آگے بڑھانے والا ہے اور تو ہی پیچھے ہٹانے والا ہے اور تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

۵۔ دین و دنیا کی بھلائی کی دُعا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دُعا کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اصلح لِی دینی الذی ھو عصمۃ امری واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی واصلح اٰخرتی التی فیھا معادی واجعل الحیاۃ زیادۃً لی فِی کُلِّ خیرٍ وَاجْعَلْ الموتَ راحۃً لِی مِنْ کُلِّ شیٍ (صحیح مسلم)

ترجمہ:۔ اے اللہ! میرے دین کو درست کر دے کہ جو میرے کاموں کا محافظ ہے۔ میری دنیا کو بھی سنوار دے کہ جس میں میری گزران ہے اسی طرح میری آخرت کو بھی درست کر دے جہاں مجھے بالآخر لوٹ کر جانا ہے۔ جب تک میں زندہ رہوں، میری زندگی کو ہر قسم کی خیر و خوبی میں زیادتی اور اضافے کا باعث بنا دے اور جب میری موت کا وقت آجائے تو میری موت کو میرے لیے ہر برائی سے راحت کا ذریعہ بنا دے۔

۶۔ ایک اور جامع دُعا۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ اس طرح دُعا مانگا کرتے تھے،

رَبِّ اعنی ولا تعنْ عَلَیَّ وانصرِنی ولا تنصُرْ عَلَیَّ وامکرلی ولا تمکر عَلَیَّ واھدِنی ویَسِّرِ الھدیٰ لِیْ وَانصُرْلِیْ عَلیٰ مَنْ بغیٰ عَلَیَّ رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ شاکراً لَکَ ذاکراً لَکَ راھباً لَکَ مطواعاً لَکَ مخبتاً الیکَ اواھًا منیباً رَبِّ تَقَبَّلْ توبتی وَاغسِلْ حوبتی وَاَجِبْ دعوتی وثبِّتْ حُجَّتی وَسَدِّدْ لسانی وَاھْدِ قلبی واسلل سخیمۃَ صدری

(ترمذی۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ)

ترجمہ:۔ اے میرے پالنے والے! تو میری مدد فرما اور میرے خلاف کسی اور کی مدد نہ فرما، مجھے فتح و نصرت عطا فرما اور میرے مقابلے میں کسی اور کو غالب نہ فرما۔ میرے حق میں خفیہ تدبیر کر اور میرے خلاف کسی کی سازش کو نہ کامیاب ہونے دے۔ مجھے ہدایت بخش اور ہدایت کو میرے لیے آسان بنا دے۔ تو ہی میری مدد فرما اس آدمی کے خلاف جو مجھ پر زیادتی کرے۔ اے میرے پروردگار! تو مجھ کو اپنا شکر گزار، ذکر کرنے والا، ڈرنے والا، فرماں بردار اور اپنی طرف عاجزی کرنے والا، گریہ و زاری کرنے والا اور رجوع کرنے والا بنا دے اے میرے پروردگار! میری توبہ قبول کر لے، میرے گناہوں کو دھو ڈال، میری دُعا کو قبول فرما، میری حجت کو باقی رکھ، میری زبان کو سچا اور پختہ بنا، میرے دل کو ہدایت دے اور میرے سینے کی سیاہی اور کدُورت کو دُور کر دے۔

۷۔ پرعظمت دُعا

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ جب اپنے اصحاب کی کسی مجلس سے اُٹھتے تو اپنے اور اپنے اصحاب کے لیے یہ دُعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَقْسِمْ لَنَا مِنْ خشیتِكَ ماتحول به بيننا وبين معاصيكَ وَ
من طاعتكَ ما تُبَلِّغُنَابه جَنَّتَكَ وَ مِنُ اليقينِ مَا تهون علينامن
مصيبات الدُنيا ومتعنا باسماعنا وابصارنا وَقوتنا مَااحييتنا و
اجعله الوارث مِنَّا واجعل ثارنا على من ظلمنا وانصرنا على
من عادانا وَلَا تجعلْ مصيبتنا فی دينا ولا تجعلُ الدُنيا اكبرهمنا وَلَا
مبلغ علمنا ولا تسلّط علينا من لا يرحمنا (ترمذی)

ترجمہ:۔

اے اللہ! تو ہم کو اپنا ایسا خوف دے کہ جو ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل نہ ہو جائے، ہم کو اپنی اطاعت اس قدر عطا کر کہ جو ہمیں تیری جنت میں پہنچا دے۔ ہمیں ایسا یقین نصیب فرما کہ جو دنیا کی مصیبتوں کو ہمارے لیے

سہل و سبک بنا دے، ہمیں اپنی سماعتوں، بصارتوں اور قوتوں سے اس وقت تک فائدہ اٹھانے کی توفیق فرما جب تک کہ زندہ رہیں۔ بلکہ اس نفع کو ہمارا ورثہ بھی قرار دے۔ ہمارے انتقام کو محض اس شخص تک محدود رکھ جس نے ہم پر ظلم کیا ہو۔ ہمیں فتح و نصرت عطا کر ان لوگوں پر جو ہم سے عداوت رکھتے ہیں۔ ہمیں دین کی مصیبت میں کبھی مبتلا نہ کر۔ دنیا کو ہماری فکر و کاوش کا مرکز نہ بنا، محض مبلغ علم کو ہمارا مطمح نظر ہرگز نہ بنا اور ہم پر ایسے لوگوں کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم کرنے والے نہ ہوں۔

قرآنی دُعاؤں کے فضائل

قرآن پاک میں جس قدر دعائیں وارد ہوئیں ہیں۔ وہ سب مقبول ہیں۔ کتاب اللہ میں تقریباً ہر دُعا کے بعد اس کی قبولیت کا تذکرہ موجود ہے، مزید جس انداز سے یہ دعائیں بیان ہوئی ہیں کہ بین السطور میں ان دعاؤں کے مانگنے کی ترغیب ہے۔

احادیث میں ان دعاؤں کی کافی فضیلت بیان ہوئی ہے اور آنحضرتؐ نے تلقین فرمائی ہے کہ ان دعاؤں کو مانگا جاتے اگر ہم احادیث میں ہر قرآنی دُعا کا تذکرہ نہیں پاتے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قرآنی دعاؤں کا مانگنا ایک طے شدہ امر تھا اور صحابہؓ کرام کا اس پر عمل تھا لہٰذا زیادہ کہنا غیر ضروری تھا۔ حدیث نے اور کئی مسائل میں یہی انداز اختیار کیا ہے مثلاً قرآن مجید کے معجزہ ہونے کی تحدی ایک فیصلہ شدہ بات ہے، قرآن نے یہ دعویٰ کیا ہے اور یقیناً آنحضرتؐ نے کفار کے سامنے پیش کیا ہوگا۔ مگر حدیث شریف نے قطعاً اس امر پر روشنی نہیں ڈالی کہ آنحضرتؐ نے کب اور کیسے یہ تحدی کفار کے سامنے پیش کی۔

حدیث شریف کا یہ سکوت اسی موقف کی بنا پر ہے اور قرآن پاک نے جو بات کہی ہے۔ آنحضرتؐ نے اس پر عمل فرمایا۔ لہٰذا حدیث میں تذکرے کی ضرورت نہیں۔

کان خُلُقُہ، القرآن (قول حضرت عائشہ صدیقہؓ)

لیکن اس کے باوجود بعض قرآنی دعاؤں کی فضیلت میں احادیث پیش پیش ہیں

اھدنا الصراط المستقیم کی دُعا ہر مسلمان روزانہ کئی بار مانگتا ہے۔ کیونکہ فرمان نبوی کے مطابق سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت میں ضروری ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً" کی دُعا مانگنے کی خود قرآن نے ترغیب دی اور جاہلیت کی عادت مفاخرہ کی تعدیل کرتے ہوئے خصوصاً اسے مناسک حج کے بعد پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رُکن اسود کے درمیان کھڑے ہو کر اس دُعا کو پڑھا کرتے تھے (ابن ماجہ) ویسے بھی آنحضرتؐ اسے بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے (بخاری ومسند احمد) اور آپؐ نے مسلمانوں کو اس دُعا کے مانگنے کی پرزور تلقین فرمائی ہے (ترمذی)

آنحضرتؐ رات کو تہجد میں آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے جن میں دانشوروں کی دُعا ربَّنا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا الخ بھی شامل ہے۔ (بخاری)

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ الخ کی دُعا میں طبرانی کی ایک حدیث کے مطابق اسم اعظم ہے کہ جب اس نام سے دُعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے۔

اہلِ ایمان کی دُعا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الخ سے پہلے والذین جاء وامن بعدھم یقولون سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کو یہ دُعا مانگنی چاہیئے۔

ابن عباسؓ کا بیان ہے رَبَّنَا اَخْرِجْنَا الخ کی دُعا مانگنے والوں میں، میں اور میری ماں شامل تھے۔ (تفسیر جلالین)

سورہ کہف کی دسویں آیت دعا پر مشتمل ہے اور مسند احمد میں ہے کہ جس شخص نے سورہ کہف کی شروع کی دس آیتیں یاد کرلیں وہ فتنہ دجال سے محفوظ ہو گیا۔

دعائے ذوالنون کے متعلق بروایت حضرت سعد بن ابی وقاصؓ آنحضرتؐ نے فرمایا جو بھی مسلمان جس کسی معاملے میں جب کبھی اپنے رَبّ سے یہ دُعا مانگ لے، اللہ ضرور قبول کر لیتا ہے (ترمذی مسند احمد) اور بقول امام حسن بصری اور امام ابنِ جریر اس دُعا میں وہ اسم اعظم موجود ہے کہ جس کے ذریعے ہر دُعا قبول ہوتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰاتِ الخ $\frac{۳۹}{۴۶}$ کے متعلق حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ نماز تہجد کو جس دُعا سے شروع کرتے تھے یہ قرآنی دُعا اس کی اساس کا درجہ رکھتی ہے۔ (مسلم)

دُعا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا میں دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ مزید آنحضرتؐ سواری کرتے وقت دیگر دعاؤں کے ساتھ ان دو آیات کی ضرور تلاوت کیا کرتے تھے جن پر یہ دُعا مشتمل ہے۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ بھی جب سواری پر ہوتے تو یہ دُعا مانگا کرتے تھے۔
(ابوداؤد۔ نسائی۔ ترمذی۔ مسند احمد)

رَبِّ احکم بالحق الخ $\frac{۲۱}{۱۱۲}$ کی دُعا آنحضرتؐ جس کسی جنگ میں بھی جاتے تو یہ دُعا مانگا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

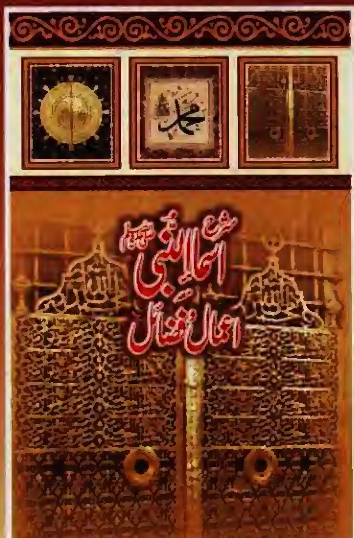
وآخر دعونا اَنِ الحَمْدُ للہ رَبّ العالمین

فصوص الحکم ——— شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی

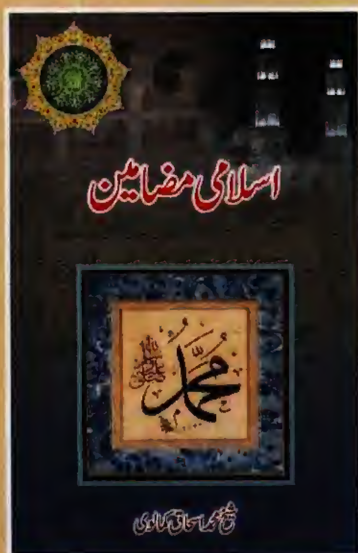
محی الدین ابن العربی المشہور بہ الشیخ الاکبر (۵۶۰ھ —— ۶۳۸ھ) کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان میں جو مقبولیت اُن کی "فصوص الحکم" کو حاصل ہوئی، وہ اُن کی کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ کتاب دمشق میں ۶۲۷ھ میں لکھی گئی اور اب تک مختلف زبانوں میں اس کے متعدد تراجم اور شروح لکھی جا چکی ہیں۔

"فصوص الحکم" میں ابن العربی نے قرآن مجید میں بیان کردہ انبیائے کرام کے حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر توحید اور تصوف کے مسائل سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ صاحبِ کتاب کے پختہ ترین فکر کی آئینہ دار ہے اور اسے موضوعاتی اعتبار سے قرآن کریم کی تفسیر بھی کہا جاتا ہے۔

فاضل مترجم محمد عبدالقدیر صدیقی صاحب نے "فصوص الحکم" کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ انہوں نے صرف ترجمے ہی پہ اکتفا نہیں کیا، بلکہ بعض دیگر معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ ابتدا میں ابن العربی کی سوانح حیات، تصانیف اور صوفیانہ عقائد پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مترجم نے "فصوص الحکم" کی اہم ترین شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ترجمہ کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے اور انہوں نے ادق مسائل کو ممکن حد تک آسان لفظوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی "فصوص الحکم" کا ایک بہتر ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔







نذیر سنز پبلشرز

40اے اردو بازار لاہور فون: 7123219

Rs: [redacted]

www.nazeersons.com
info@nazeersons.com